منٹو کے مضامین

منٹو کے مضامین

سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو دہلی

MANTO KE MAZAMEEN
- SAADAT HASSAN MANTO

ISBN 81-85772-21-5

قیمت: ـــــــــ پچھتر روپے
Rs. 75.00

سن اشاعت : ۱۹۹۷
طابع : شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی

ـــــ ناشر ـــــ
ساقی بک ڈپو
اردو بازار۔ دھلی ۱۱۰۰۰۶

SAQI BOOK DEPOT
4157A, URDU BAZAR
DELHI-110006

لوگ مجھے جانتے ہیں۔ اس لئے "تعارف" کی ضرورت نہیں
"پیش لفظ" میں نے اس لئے نہیں لکھا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے،
میں نے اپنے مضامین میں کہہ دیا ہے۔ "دیباچہ" یا "مقدمہ"
میں نے اس لیے کسی سے نہیں لکھوایا کہ میرے نزدیک
یہ اُس شہ بالے کی طرح مضحکہ خیز حد تک غیر ضروری اور غیر اہم
ہے جو دولہا کے آگے یا پیچھے گھوڑے پر سجا بنا کر بٹھا دیا
جاتا ہے۔

سعادت حسن منٹو

دہلی - ۲۲ر اپریل ۱۹۴۲ء

وُہ گھر جس میں کتابیں نہ ہوں اُس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو

سُقراط

حفیظ جاوید کے نام

فہرس

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد ۹

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی ۲۹

دیہاتی بولیاں ۵۱

دیہاتی بولیاں ۵۹

تحدید اسلحہ ۶۷

ہندی اور اُردو ۷۱

اگر ۷۷

ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ ۸۷

ایک اشک آلود اپیل ۹۱

مجھے شکایت ہے ۹۷

شریف عورتیں اور فلمی دنیا ۱۰۹

ہندوستانی صنعت فلمسازی پر ایک نظر ۱۱۷

"زندگی" ـــــ ایک ریویو	۱۴۵
عصمت فروشی	۱۶۱
میکسم گورکی	۱۷۹
سرخ انقلاب	۲۴۳
باتیں	۲۵۷
لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں	۲۶۵
کسان مزدور، سرمایہ دار، زمیندار	۲۸۹
ترقی یافتہ قبرستان	۲۹۵
مجھے بھی کچھ کہنا ہے	۳۰۷

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ سو جب تک مردوں کو وصل نصیب نہیں ہوتا، وہ حسرت ہی سے اپنا دل بہلاتے رہیں گے اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا۔ وہ مرد کون تھا جس نے پہلی بار کسی عورت کو چھیڑا۔ اس کے متعلق تاریخ سے ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہت ممکن ہے باغِ عدن کی کسی گھنی جھاڑی کے عقب میں یا کسی سایہ دار درخت کے نیچے حضرتِ آدم ہی نے یہ سلسلہ شروع کیا ہو کیونکہ وہ جنت سے یونہی تو نکالے نہیں گئے تھے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت آدم ہی نے اس دلچسپ سلسلے کا آغاز کیا تھا تو "پہلی چھیڑ" کا تصور ممکن نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چھیڑ بے حد خام ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چھیڑ میں انتہا درجے کی لطافت اور نزاکت ہو۔ دراصل اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کے کردار و اطوار سے ہم قطعاً ناآشنا ہیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اماں حوا نے اس چھیڑ کو کس رنگ میں دیکھا اور ان کے دل و دماغ میں اس چھیڑ نے کس قسم کا ردِ عمل پیدا کیا ——— طرح

طرح کے تصور دماغ میں آتے ہیں۔ پہ کوئی صحیح تصویر نہیں بنتی۔ دو برہنہ سائے سے ایک خیالی باغ میں ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد حال کے نقوش کچھ اس طرح اُبھرتے ہیں کہ تصور امریکہ کے کسی ننگے کلب کی طرف چلا جاتا ہے۔ باوا آدم صاحب بن جاتے ہیں اور اماں حوا ان کی میم۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی ——— یورپ میں جہاں ترقی پسندی کا دور دورہ ہے اور تہذیب و تمدن کی چولی کے بند کھلے ہوئے ہیں۔ حسرتیں کم ہیں اور وصل زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود وہاں چھیڑ چھاڑ عام دیکھنے میں آتی ہے۔ نقاب اٹھنے پر بھی وہاں کی بے نقاب عورتیں اُسی طرح گھوری جاتی ہیں، جس طرح یہاں ہندوستان کی نقاب پوش عورتوں کے نقاب گھورے جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی زوروں کی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ۔ دراصل جنسی بھوک کچھ اس قسم کی بھوک ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ جب تک مرد اور عورت پاس پاس رہیں گے، یہ چھیڑ چلی جائے گی یا پھر کوئی ایسا زمانہ آئے کہ عورت کا وجود مرد کے لئے غیر ضروری ہو جائے تو چھیڑ کا یہ سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس سے پہلے اس کا خاتمہ ممکن نہیں۔

پچھلے دنوں گاندھی جی نے آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے بارے میں ارشاد کیا تھا: "ایک جولیٹ کے سو سو روسیو موجود ہیں"۔ اس پر لاہور میں وہ شور مچا تھا کہ خدا کی پناہ۔ مس ممتاز شاہ نواز اور دوسری خواتین نے گاندھی جی کے اس حملے کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ بہت دیر تک مستورات کے مضامین ہندوستان کے اس بیم مستور لیڈر کے خلاف چھپتے رہے۔ گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے ایک مضمون اور لکھا اور اس میں تہذیب نو کے گرفتار لڑکوں کو اپنے اہنسائی تیروں کا نشانہ بنایا۔ ان نوجوان

سے گاندھی جی نے کہا "تم بازار میں جب چلو تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرو۔ اگر ہو سکے تو ——— ہڈ پہنا کرو تاکہ تمہاری نگاہیں نوجوان لڑکیوں پر نہ پڑ سکیں۔ اور تمہارا ایمان متزلزل ہونے سے بچ سکے۔"

ہندوستان پر گاندھی جی کا اثر مسلّم ہے۔ پران کا یہ مضمون نوجوانوں کے جذبات پر اثر انداز نہ ہو سکا ——— خوباں سے چھیڑ جاری رہی۔ نگاہوں پر سنسر نہ بیٹھ سکا جذبات ویسے کے ویسے بے لگام ہیں۔ گاندھی جی کی یہ سعی ویسی ہی ناکام رہی۔ جیسے بمبئی میں امتناعِ شراب کے بارے میں کانگرس گورنمنٹ کی کوشش۔

گاندھی جی کی یہ کوشش اگر بارآور ثابت ہوتی تو ذرا غور کیجئے کہ معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ——— گلی کوچوں اور بازاروں میں آپ کو مرد ماتھے پر ہڈ باندھے اور نگاہیں نیچی کئے چلتے پھرتے نظر آتے۔ ٹریفک میں کئی مشکلات پیدا ہو جاتیں اور ہر روز حادثے وقوع پذیر ہوتے۔ اور ان حادثوں کا شکار صرف مرد ہوتے۔ ماتھے پر ہڈ ــــــ ، نگاہیں فرش پر، سامنے سے تیز رفتار موٹر آ رہی ہے، ادھر ادھر جوان عورتیں جا رہی ہیں۔ ہارن پر ہارن بجایا جا رہا ہے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ایک عجیب مشکل میں آدمی پھنس جاتا۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر جاتا۔ وہاں بھی بیچارے مردوں کی آنکھوں پر ہڈ چڑھا رہتا کہ کسی نرس کو نہ دیکھ پائیں۔

ہڈ وڈ کی بات چھوڑیئے۔ روزمرہ کی زندگی بالکل بے کیف ہو جاتی، جذبات کا دریا بند پانی کی طرح ٹھہر جاتا۔ امنگیں، خیال آرائی کی تمام قوتیں، جذباتی ہیجان، غرضیکہ وہ سب کچھ جس سے انسانی زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے، فنا ہو جاتا ——— عورت ہوتی، مرد بھی ہوتے لیکن وہ چنگاری نہ ہوتی جو ان دونوں کے تصادم سے پھوٹتی

ہے۔ جوانیوں کے بھرے بھرے جام ہونٹوں کے لمس کو ترستے رہتے۔ رنگینیاں اور شرارتیں بالکل مفقود ہو جاتیں۔ چاروں طرف متانت اور سنجیدگی نظر آتی۔ چہرے بلبوترے ہو جاتے۔ ان کی تازگی، ان کی رونق اور ان کی دمک سب غائب ہو جاتی۔ زندگی کے اُکتا دینے والے یک آہنگ تسلسل میں آدمی بالکل بے جان اور مُردہ ہو کے رہ جاتا۔ ملک کی شاعری اور اس کے ادب کا ستیا ناس ہو جاتا۔ فنونِ لطیفہ سب کے سب یتیم ہو جاتے ——— مگر یہ نہ ہوا اس لئے کہ اس کا ہونا ممکن نہیں تھا۔

ہر بالغ مرد اور ہر بالغ عورت کو معلوم ہے کہ یہ چھیڑ چھاڑ کیوں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی خلافِ عقل چیز نہیں۔ لیکن یہاں وہ چند بیانات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے جو میں نے بڑی کاوش سے چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کے متعلق حاصل کئے ہیں۔

میں نے پہلے ذیل کے سوالات لڑکوں کے لئے تیار کئے۔

۱۔ تم لڑکیوں یا عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہو ——— کیا اس کی کوئی وجہ تم بیان کر سکتے ہو؟

۲۔ کس قسم کی لڑکیوں یا عورتوں کو تم زیادہ چھیڑتے ہو؟

۳۔ تمہارے چھیڑنے کا طریقہ کیا ہے؟

۴۔ کیا تمہارے خیال میں لڑکیاں یا عورتیں ایسی چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں؟

۵۔ کوئی ایسا واقعہ بیان کرو جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے وابستہ ہو اور جس کے نقش تمہارے ذہن پر مرتسم ہو چکے ہوں۔

میں نے یہ پانچ سوال بارہ لڑکوں سے کئے جن کی عمر سولہ سے لے کر چوبیس برس

کے درمیان رہتی - ان میں سے سات لڑکے جو تعلیم یافتہ تھے، مجھے پہلے سوال کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ باقی پانچ لڑکوں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے جواب ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ جو کچھ انہوں نے اس ضمن میں کہا اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

"ہم لڑکیوں اور عورتوں کو اس لئے چھیڑتے ہیں کہ ہمیں اس میں مزہ آتا ہے۔ زیادہ مزا ہمیں ان لڑکیوں کو چھیڑنے میں آتا ہے جو ہماری دراز دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرسکیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو جائیں، گالیاں ان کی زبان کی نوک پر آ آ کر رک جائیں۔ غصے کے اس خاموش اظہار کا لطف بیان سے باہر ہے ـــــ ہم اس لئے ان کو چھیڑتے ہیں ـــــ کہ اس چھیڑ کی تحریک ہمارے اندر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات بازار میں چلتے ہوئے کئی خوب صورت اور پُر شباب لڑکیاں ہمارے پاس سے گزر جاتی ہیں مگر ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دراصل چھیڑنا موڈ کی بات ہے۔ اگر موڈ ایسا ہو تو کوئی لڑکی ہماری چھیڑ سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ بعض اوقات ہمیں گالیاں سننا پڑتی ہیں اور خطرناک حادثوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے ہماری یہ سرگرمی کچھ دیر کے لئے ماند پڑ جاتی ہے، مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ عورت کی بے بسی سے ہم ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر عورت کی بے بسی ہمیں بے بسی نظر نہیں آتی، اس لئے کہ وہ ہماری پہنچ سے بہت دور رہتی ہے۔ اس کے خیالات و محسوسات سے چونکہ ہم غافل ہیں، اس لئے ہمیں وہ اونچے درخت کی ٹہنیوں سے الجھی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی ہے جس پہ کنکر مارنے کا خیال خواہ مخواہ دل میں پیدا ہو جاتا ہے ـــــ آپ پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو کیوں

چھیڑتے ہیں، ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو کیوں نہ چھیڑیں؟ اگر ہم انہیں نہ چھیڑیں گے تو اور کون چھیڑے گا۔ ہمارے اور ان کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ اس قسم کے چلے آئے ہیں کہ یہ چھیڑ چھاڑ ضروری ہے؟

ان پانچ نوجوانوں میں سے ایک لڑکا جس کی عمر چوبیس برس کی تھی، بہت ہوشیار تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہیں؟ اس کا جواب تو آپ کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ میں نے پرسوں بازار میں جاتے ہوئے ایک کتے کی طرف دیکھا۔ ایک دم نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اُسے آنکھ ماردی۔ اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے اس کو آنکھ کیوں ماری تو میں آپ کو خاطر خواہ جواب نہ دے سکوں گا۔ اس لئے کہ میں اس لمحاتی جذبے کا تجزیہ نہیں کر سکتا جو اس عجیب و غریب حرکت کا باعث ہوا؟

دوسرے سوال کا جواب آٹھ لڑکوں نے یہ دیا کہ ہم ان لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں یا ان لڑکیوں کو چھیڑنے کے لئے ہمارے اندر اکساہٹ پیدا ہوتی ہے۔ جو جوان ہوں اور جنہیں اپنی جوانی پر ناز ہو۔ یہ ناز ان کی چال ڈھال میں صاف نظر آجاتا ہے۔

دو لڑکوں نے اسی سوال کا جواب یوں دیا: ہم صرف ان لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں جو ہمیں عین موقع پر پسند آجائیں۔ بعض اوقات معمولی شکل و صورت اور معمولی جوانی کی لڑکیوں کو چھیڑنے کو دل چاہتا ہے اور بعض اوقات غیر معمولی طور پر حسین اور تیکھی لڑکیوں ہی کو چھیڑا جاتا ہے۔ یہ محض اکساہٹ کی بات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اکساہٹ لڑکیاں خود پیدا کرتی ہیں۔ چھیڑنے کا مادہ تو ہمارے اندر موجود ہے مگر اس بارود

کو آگ وہی دکھاتی ہیں ـــــ"

باقی دو لڑکوں نے کہا۔ "ہم صرف موٹی اور گول گپی لڑکیوں کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ دُبلی پتلی لڑکیوں کو ہم نے کبھی نہیں چھیڑا۔ موٹی اور بھاری جسم کی لڑکی کو چھیڑنے میں بہت مزا آتا ہے۔"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "بازار میں یا گلی میں جہاں کہیں موٹی لڑکی مجھے نظر آجائے میں آنکھ ضرور مارتا ہوں۔ اس میں ایک خاص لُطف آتا ہے مجھے، جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھ اس کے نرم نرم جسم میں کُھب گئی ہے۔ موٹی لڑکیاں یوں بھی زیادہ شرمیلی ہوتی ہیں۔ ان کو آنکھ ماری جائے تو شرم سے ان کے گدگدے گال جب تھرتھراتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔"

تیسرے سوال کا جواب دس لڑکوں نے ایک جیسا دیا۔ انہوں نے کہا۔ "چھیڑنے کے طریقے یوں تو بہت سے ہیں۔ لیکن عام طریقہ یہی ہے کہ راہ چلتی لڑکی آنکھ ماری جائے آنکھ سے چھیڑنا خطرناک نہیں، اس لئے کہ اس میں ترمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے بھی آنکھ ماری جائے تو نشانے پر بیٹھتی ہے اور اپنا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ آنکھ محض شرارت کے طور پر ماری جاتی ہے۔ مگر اس جھپک میں یہ سوال بھی پوشیدہ ہوتا ہے "کیا خیال ہے تمہارا؟" صرف ایک پلکارے کے ذریعے سے یہ سوال جس میں ہزار ہا سوال منجمد ہوتے ہیں ایک سیکنڈ سے کم عرصے میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کا جواب عام طور پر ایک نفرت انگیز اور خشم آلود گھبراہٹ ہوتی ہے جو لڑکی کے سارے جسم پر چشم زدن میں پھیل جاتی ہے۔ آنکھ مارنا اس لئے زیادہ خطرناک نہیں کہ اس شرارت کا ٹھوس ثبوت بہم پہنچانا بہت مشکل ہے۔ ذرا آنکھ جھپکائی، لڑکی کے چہرے پر انگارے سے بکھرے اور چل دیئے۔

کبھی کبھی کوئی لڑکی مسکرا بھی دیتی ہے اور یہ مسکراہٹ دیر تک ہمیں یاد رہتی ہے، اس لئے کہ اس میں ایک ایسی تیتری کے رنگ ہوتے ہیں، جو ہاتھ نہیں آسکتی۔ بس ایک لمحے کے لئے یہ مسکراہٹ ہماری آنکھ کی جھپک سے تیتری کے ہلکے پھلکے پروں کی طرح چھوتی ہے اور چھیڑ چھاڑ اکر اڑ جاتی ہے ـــــ آنکھوں کو چھوڑ دیجئے تو جسم میں زبان کے علاوہ صرف ہاتھ باقی رہ جاتے ہیں جن سے چھیڑا جا سکتا ہے، ہم ان سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن بہت کم، اس لئے کہ ہاتھ اکثر اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ جہیڑ بھاڑ زیادہ ہو، کوئی میلا ٹھیلا ہو اکھڑے سے کھوا اچھل رہا ہو، اس افرتفری میں کسی لڑکی کو اگر گدگدا دیا جائے تو اتنا زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔ نمائش میں رات کے وقت اس مقام پر جہاں اونچی سیڑھی پر سے بازی گر کو نیچے آگ کے کنوئیں میں چھلانگ لگانا ہوتی ہے کافی ہجوم ہوتا ہے۔ یہاں ہم اکثر لڑکیوں کے گدگدیاں کیا کرتے ہیں۔ بعض اوقات اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ کر ہم تیزی سے آگے نکل جایا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کاندھے سے ہلکا سا دھکا بھی دے دیا جاتا ہے۔ بس ہم صرف یہی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

باقی دو لڑکوں میں سے ایک نے کہا "میں نے آج تک کسی لڑکی کو آنکھ نہیں ماری۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آنکھ ماری جاتی ہے اور میں نے کئی لڑکوں کو آنکھ مارتے بھی دیکھا ہے۔ مگر میں کوشش کے باوجود یہ چیز سیکھ نہیں سکا۔ میں جب کبھی ایک آنکھ سکیڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری دوسری آنکھ بھی بند ہو جاتی ہے۔ میں اسی وجہ سے کسی کو آنکھ نہیں مارتا۔ میں نے ہاتھ سے بھی آج تک کسی لڑکی کو نہیں چھیڑا۔ میرا چھیڑ چھاڑ کا طریقہ سب سے جدا اور انوکھا ہے۔ میں راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھا کرتا ہوں۔ اس سے مجھے بہت لطف حاصل ہوتا ہے۔ وقت میں صرف انہی سے پوچھتا ہوں جن کی کلائی

پر گھڑی بندھی ہو۔ آج تک کسی لڑکی نے مجھے وقت بتانے سے انکار نہیں کیا۔ لیکن بہت کم لڑکیاں مجھے گھڑی دیکھ کر وقت بتا سکتی ہیں۔ اس لئے کہ ایک دم جب کسی لڑکی سے وقت پوچھا جائے تو وہ سخت گھبرا جاتی ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں خود اپنے آپ کو گھبرایا ہوا ظاہر کرتا ہوں جیسے مجھے ایک خاص وقت پر کہیں پہنچنا ہے۔ اس قسم کی اضطراری کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے میں ادھر ادھر پریشانی کے عالم میں دیکھا کرتا ہوں، پھر جیسے اچانک میری نگاہیں اس کی گھڑی پر جا پڑی ہیں، میں پوچھا کرتا ہوں: "معاف فرمائیے گا، آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟" بس وقت پوچھا، جو کچھ اس نے بتایا سنا اور تیز قدمی سے چل دیئے۔ بعض اوقات شکریہ ادا کر دیا اور بعض اوقات مصنوعی گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گئے۔ پانچ برس کے عرصے میں ایک سو ستاون لڑکیوں سے میں وقت پوچھ چکا ہوں۔ ایک بار جس سے میں وقت پوچھتا ہوں۔ اس کی شکل و صورت اچھی طرح یاد رکھتا ہوں تاکہ پھر اس سے وقت نہ پوچھوں۔"

دوسرے لڑکے نے اس کا جواب یوں دیا: "مجھے صرف زبانی چھیڑ چھاڑ پسند ہے۔ میں نے پانچ چھ بار آنکھ بھی ماری ہوگی۔ مگر زیادہ لطف مجھے زبانی چھیڑ چھاڑ میں آتا ہے۔ بازار میں کسی لڑکی پر ایسا فقرہ کسنا کہ صرف وہی سمجھے، آس پاس کے لوگ نہ سمجھیں یقیناً ایک فن ہے۔ مگر ایسے فقرے ہر روز نہیں کسے جا سکتے۔ دماغ روشن اور حاضر ہو۔ کوئی محرک مل جائے تو فقرہ کسنے میں ایسا لطف آتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

چوتھے سوال کا جواب نو لڑکوں نے بالکل ایک جیسا دیا: "ہمارا خیال ہے کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہیں کرتیں، اس لئے کہ عورت اور مرد کے درمیان اس وقت

تک مفاہمت کا کوئی رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ میاں، بیوی نہ بن جائیں۔
عورت مرد کی طرف یوں دیکھتی ہے جیسے بکری قصائی کی طرف ——— مرد کا تصور ہمیشہ
عورتوں کو عصمت کے تنے ہوئے رستے پر کھڑا کر دیتا ہے سایسا ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات
ہماری یہ چھیڑ چھاڑ محض ایک معصوم تفریح کے لئے ہو مگر عورت اس معصوم تفریح کو بھی گناہ
اور ثواب کی خطرناک طور پر نازک ترازو میں تولے گی ——— سچ پوچھئے تو ہمارے
پیش نظر صرف عورت ہوتی ہے، جو کچھ اس کے عقب میں ہے ہم نے اس پر کبھی غور نہیں
کیا ——— وہ اگر خوش نہیں ہوتی ہے تو نہ ہو۔ اگر ناراض ہوتی ہے تو ہوا کرے، ہماری
یہ چھیڑ جاری رہے گی۔"

دو لڑکوں نے اس سوال کا جواب یوں دیا۔ "عورتیں ہماری چھیڑ چھاڑ پسند کرتی بھی
ہیں اور نہیں بھی کرتیں۔ دراصل عورت ہاں اور نہ کا ایک نہایت ہی دلچسپ مرکب ہے
یہی وجہ ہے کہ ہم اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر اس میں ہاں اور نہ کا یہ
الجھاؤ نہ ہوتا تو ہم اسے کبھی نہ چھیڑتے۔ انکار اور اقرار کچھ اس طرح عورت کے وجود میں
خلط ملط ہو گیا ہے کہ بعض اوقات اقرار انکار معلوم ہوتا ہے اور انکار اقرار ——— ہمیں
تو اسی چیز نے مار رکھا ہے۔"

ایک لڑکے نے اس سوال کا جواب بالکل مختلف طور پر دیا۔ "اجی صاحب چھوڑیئے
لڑکیاں اس چھیڑ چھاڑ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ عورت کی جوانی اور مرد کی جوانی میں لمبا چوڑا
فرق ہی کیا ہے۔ بس یہی نا کہ وہ شلوار قمیص یا ساڑھی پہن کر جوان ہوتی ہے اور ہم پتلون
کوٹ کے اندر جوان ہو جاتے ہیں ——— میں تو صرف اس لئے لڑکیوں کو چھیڑتا ہوں کہ
وہ اسے پسند کرتی ہیں ——— جب ہم انہیں چھیڑتے ہیں تو وہ تخلئے میں اپنی سہیلیوں کو

اپنے تاثرات ضرور بتائی ہیں۔ یہ تاثرات ان سہیلیوں پر عجیب و غریب کپکپاہٹیں طاری کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں اور نہ مجھے معلوم ہے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری پھونکوں سے لڑکیوں کے کنوارپن کی لَو جب لرزتی ہے تو ایک عجیب ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اگر اس حقیقت کا احساس مجھے نہ ہوتا تو میں ہرگز ہرگز کسی لڑکی کو نہ چھیڑتا۔"

اب میں آخری سوال کے جوابات کی طرف آتا ہوں۔ ہر لڑکے نے ایک واقعہ بیان کیا جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق تھا۔ مگر ان میں سے صرف چند اس قابل ہیں کہ یہاں درج کروں۔ اکثر واقعات کچھ اس قسم کے تھے ——— ایک لڑکی کو چھیڑا گیا۔ اس نے شور مچا دیا جس کے باعث چھیڑنے والے کی بہت بدنامی ہوئی، وغیرہ وغیرہ۔

سب سے دلچسپ داستان اس لڑکے نے مجھے سنائی جس نے ایک بار کتے کو آنکھ ماری تھی۔ اس نے کہا: "آج سے چار برس پہلے کا ذکر ہے۔ امرت سر میں کانگرس تحریک کے باعث دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ جلیانوالہ باغ میں طلبا اور دوسرے لوگوں کا ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ میں ہر روز شام کو اشٹنڈی کرنے کے بہانے سے جلیانوالہ باغ میں جاتا تھا۔ ایک روز جب کہ میں اس باغ میں جانے کے لئے بازار طے کر رہا تھا، میری نگاہ بغیر کسی مطلب کے اوپر کو اٹھی۔ ایک سالخوردہ مکان کی بالکونی میں مجھے ایک سفید پگڑی نظر آئی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سمجھا کہ کوئی سکھ ہوگا، پر جب وہ پگڑی اونچی ہوئی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے سانولے رنگ کی ایک تیکھے نقشوں والی لڑکی کو دیکھا اس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ آہنی جنگلے میں سے اس کا چوڑی دار پاجامہ بھی مجھے نظر آیا کمبخت نے اچکن بھی پہن رکھی تھی، جو اس کے بہت پھنس کر آئی تھی اس نے میری طرف جب دیکھا تو میں نے بلند آواز میں کہا "تسلیم عرض کرتی ہوں" یہ سن کر وہ

بوکھلا سی گئی۔ ایک کھسیانی سی شرم آلود ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور میری تیز نگاہوں سے پہلو بچا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ جلیانوالہ باغ میں اسٹوڈنٹ یونین کیمپ کے اندر جا کر میں نے اپنے چند دوستوں کو یہ واقعہ سنایا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک کانگرس ورکر کی بیوی ہے جو تین چار روز سے قید خانے میں ہے۔ لڑکی کی شادی کو مشکل سے چار پانچ مہینے ہوئے تھے۔ خاوند کی گرفتاری کے بعد اب وہ اکیلی اس مکان میں رہتی تھی۔ یہ تمام باتیں جب مجھے معلوم ہو گئیں تو میں سیدھا اپنے گھر روانہ ہوا جو وہاں سے دور نہیں تھا۔ گھر جا کر اپنے کمرے کو بند کر کے میں نے بلاؤز پہنا۔ بلاؤز کے نیچے میں نے ربڑ کی گیند کے دو ٹکڑے کر کے سینے پر جما لئے۔ پیٹی کوٹ پہنا، پھر ساڑھی پہنی۔ اس زمانے میں میرے بال بہت لمبے تھے۔ سیدھی مانگ نکال کر میں نے چند لٹیں ادھر اور ادھر چھوڑ دیں۔ ان دنوں عورتوں میں چپل پہننے کا رواج عام تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا چپل ہی پاؤں میں رہنے دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے خود پر عورت کا دھوکا ہونے لگا۔ لباس آدمی کو کتنا تبدیل کر تا ہے ـــــ خیر، بہن کا برقعہ اوڑھ کر میں چلا۔ گلی میں کئی بار مجھے ٹھوکریں لگیں۔ اس لئے کہ برقعہ پاؤں میں اُلجھ اُلجھ جاتا تھا۔ عورتوں کی چال بھی مجھ سے نہیں چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ کوئی راستے میں بھانپ لے گا تو بہت خفیف ہونا پڑے گا۔ بہرحال ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے میں نے تین بازار طے کیے اور اس مکان پر پہنچ گیا۔ حلوائی کی دوکان کے ساتھ ہی اس مکان کی سیڑھیاں تھیں میں نے منہ پر سے برقعہ ذرا اونچا کیا اور اوپر چڑھ گیا۔ دل میرا دھک دھک کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس کوئی دم میں سینے سے نکل کر سیڑھیوں پر آ پڑے گا لیکن شرارت کا تصور اس کمزوری پر غالب آیا۔ میں نے دستک دی اور دستک دیتے ہی سوچ لیا، اگر کوئی مرد

سامنے آگیا تو میں کچھ لیے بنے بغیر نیچے چلا آؤں گا۔ ورنہ اگر ضرورت پڑی تو آواز میں باریکی پیدا کر کے کہہ دوں گا۔ معاف کیجئے گا، میں غلطی سے ادھر چلی آئی ــــــ چنانچہ یہ سوچتے ہی میں نے ایک بار اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل پہلو سے نکل کر اندر کمرے کے فرش پر چل رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں، پر اندر سے کنڈی کھل چکی تھی۔ میں نے اٹھا ہوا برقعہ نیچے چھوڑ لیا۔ دروازہ کھلا۔ وہ لڑکی میرے سامنے تھی۔ مجھ سے زیادہ بوکھلائی ہوئی۔ سر کے بال پریشان ہو رہے تھے۔ مردانہ قمیص اس نے پہن رکھی تھی۔ پائجامہ دیسی تھا چوڑی دار۔ کاندھے پر اس نے دوپٹہ بڑی بے ترتیبی سے ڈال رکھا تھا۔ برقعہ پوش عورت کو دیکھ کر اس کے ہوش بجا ہوئے میرے بھی سانس میں سانس آیا۔ اس نے کہا۔ "اندر آجائیے۔" میں بے دھڑک اندر چلا گیا ایک بڑا کمرہ تھا۔ اس کو طے کر کے ہم دوسرے کمرے میں پہنچے جو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ اس چارپائی پر مجھے وہ اچکن دکھائی دی۔ جس کو اس نے پہن رکھا تھا۔ اس کی ایک آستین الٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی سفید پگڑی دھری تھی۔ اس نے کئی بار مجھے سر تا پا دیکھا۔ میری آمد اس کے لئے ایک معما بنی ہوئی تھی۔ اس چھوٹے کمرے میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ "تشریف رکھئے۔" اور یہ کہہ کر اس نے کرسی پر سے چند کتابیں اٹھا کر چارپائی پر رکھ دیں۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میری پریشانی کسی حد تک دور ہو گئی تھی مگر میرا دھیان دروازے کی طرف تھا جو وہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ بے شمار خیالات میرے دماغ میں آ رہے تھے۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے مہمان نوازانہ انداز میں کہا۔ "برقعہ اتار لیجئے۔" میں نے اس کے جواب میں ادھر ادھر دیکھا تو اس نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔" میں دل ہی دل میں ارادہ کر

چکا تھا کہ کوئی بات نہ کروں گا۔ مگر یہ الفاظ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گئے "آپ باہر کا دروازہ بند کر دیجئے۔" لہجہ میرا اپنا تھا۔ مگر اسے شک نہ ہوا۔ وہ فوراً اٹھی اور دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ میں نے اس دوران میں حالات پر غور کیا اور چہرے پر سے نقاب ہٹا لی۔ سر میرا برقعے کی ٹوپی میں تھا۔ دونوں کان بھی اس میں چھپے ہوئے تھے۔ چہرہ بالوں سے بے نیاز تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس کو صدمہ اچانک نہیں پہنچے گا۔ دروازہ بند کر کے وہ آئی۔ میں نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی اور بیٹھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی جیسے بھڑ نے اسے کاٹ کھایا ہے۔ میری طرف دیکھ کر اس کے منہ سے مدھم سی چیخ نکلی ——

انگریزی ضرب المثل کے مطابق بلی بیگ میں سے نکل چکی تھی۔ میں نے برقعہ اتار دیا۔ اس کی ٹانگیں چوڑی دار پائجامے میں کانپ گئیں۔ میری جرأت بڑھ گئی۔ مسکرا کر میں نے کہا "آداب عرض کرتی ہوں۔" وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ اور خوف نے اس کو جھنجوڑ دیا تھا۔ میں نے اس کی خوفزدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آپ کو مردانہ لباس خوب سجتا ہے، کیا میرے بدن پر آپ کا یہ لباس اچھا نہیں لگتا" —— اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، اگر چھت نیچے آ رہتی یا آسمان سے ناگہانی طور پر بجلی گر پڑتی تو اس کو اتنا خوفناک تعجب کبھی نہ ہوتا جتنا کہ میری آمد پر اسے ہوا۔ اس کی زبان بالکل گنگ ہو گئی تھی۔ اگر وہ چیخنا بھی چاہتی تو ناکام رہتی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا چنانچہ میں اپنا برقعہ اٹھا کر کہا "گھبرائیے نہیں، میں چلتا ہوں، مذاق ختم ہو گیا۔" جب میں نے وہاں سے چلنے کا قصد کیا تو اس نے لرزاں آواز میں کہا "ذرا ٹھہریئے۔"

میں ٹھہر گیا "فرمایئے۔"

اس نے میرے بلاؤز کی طرف دیکھا جس میں سے گیند کے ٹکڑے نیچے ڈھلک آئے

تھے۔ شرم سے اس کے کان کی سانولی لویں سرخی مائل ہو گئیں۔ لیکن بے اختیار اس کو ہنسی آ گئی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اس سے اس کا خوف کچھ دور ہوا۔ چنانچہ اس نے غیر لرزاں آواز میں کہا "آپ اس لباس میں گھر واپس جا سکیں گے؟"

میں نے جواب دیا "کیوں نہیں؟ —— آیا بھی تو اسی لباس میں تھا"

لیکن یہ کہتے ہی ایک دم اندرونی طور پر مجھے محسوس ہوا کہ میں اس لباس میں ہرگز ہرگز ایک قدم بھی نہ اٹھا سکوں گا۔

اس نے میرا جواب سن کر کہا "آپ سوچ لیجئے"

اور جب میں نے سوچنا شروع کیا تو یہ احساس اور زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ میں نے سوچا کہ ساڑھی اتار دوں، لیکن بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تو میں بالکل اسٹیج کا مسخرہ بن جاتا۔ پھر خیال آیا کہ سب کچھ اتار دوں اور ساڑھی کا تہمد بنا لوں، مگر یوں لوگوں کی نگاہیں اور بھی میری طرف اٹھتیں۔ پھر سوچا کہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلوں۔ مگر یہ تصور اب ایک بہت بڑا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے گھبرا کر اس سے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو یہاں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں"

اس نے میری درخواست رد نہ کی۔ "تشریف رکھئے" لیکن فوراً ہی اسے کوئی خیال آیا اور وہ مضطرب ہو گئی۔ "نہیں، آپ اب تشریف لے جائیے۔ میرے فادر ان لا آنے والے ہیں —— میں بھول ہی گئی تھی —— جائیے، یہاں سے جلدی چلے جائیے"

میں اس قدر گھبرا گیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سارے کپڑے اتار کر کسی نے مجھے ننگا کر دیا ہے۔ میں بجائے اٹھنے کے اور جم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے مجھ سے زیادہ گھبرا کر کہا "میرے فادر ان لا آنے والے ہیں —— بس اب وہ آنے ہی

ہوں گے ۔۔۔ آپ چلے جائیے۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اسی غصے میں اس سے میں نے تیز لہجے میں کہا "تو میں کیا کروں۔ اس لباس میں مجھ سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔"

موقع کی نزاکت کے باوجود اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن میری سنجیدگی ویسی کی ویسی قائم رہی۔ اس نے چند لمحات غور کیا اور پھر کہا "آپ یہ اچکن پہن لیجئے۔ میں آپ کو قمیص اور پائجامہ نکال دیتی ہوں، مگر پرماتما کے لئے جلدی کیجئے۔ اب کچھ سوچئے نہیں۔"

اس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا۔ چارپائی کے نیچے سے ایک ٹرنک کھینچ نکالا۔ اس میں سے جلدی جلدی اس نے ایک قمیص نکالی۔ پائجامہ وہ دیر تک ڈھونڈتی رہی مگر اسے نہ ملا۔ میں اس دوران میں بلاؤز اتار کر قمیص پہن چکا تھا۔ جب پائجامہ نہ ملا تو اس نے کہا "آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں یہ پائجامہ اتار کر آپ کو دے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھرتی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دو منٹ شدید قسم کے اضطراب میں گزرے۔ اس کے بعد وہ آئی۔ پائجامہ دے کر وہ باہر چلی گئی "اب جلدی پہن لیجئے۔"

میں نے افراتفری میں یہ پائجامہ پہنا۔ چونکہ چوڑیاں کافی زیادہ تھیں۔ اس لئے کھینچ تان کر پورا آ ہی گیا۔ اتنے میں آواز آئی "پہن لیا؟"

میں نے کہا "ہاں پہن لیا۔"

یہ سن کر وہ اندر آئی اور کہنے لگی "پرماتما کے لئے یہاں سے چلے جائیے ۔۔۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں آ نہ جائیں۔"

میں نے اچکن پہنی۔ برقعہ ہاتھ میں لیا اور وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اس نے کہا "یہ ساڑھی وغیرہ تو لیتے جائیے۔"

نیلے بلاؤز، ساڑھی، پیٹی کوٹ اور ربڑ کی گیند کے دونوں ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔ یہ سب چیزیں یہیں پڑی رہیں۔" اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ میں دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ آئی جب دروازہ کھول کر میں باہر نکلا تو اس نے مسکرا کر کہا۔" آداب عرض کرتا ہوں ——— اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہ ہوئی، کیونکہ وہ دوسرے روز ہی کہیں چلی گئی، نہ معلوم کہاں میں نے اس کا بہت کھوج لگایا مگر کچھ پتہ نہ چلا، اس کی اچکن اور پائجامہ ابھی تک میرے پاس محفوظ پڑا ہے۔ شاید میری ساڑھی، بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی اس کے پاس ابھی تک محفوظ ہوں اور گیند کے وہ دو ٹکڑے بھی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ واقعہ ایسا نہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھول سکے۔"

اس لڑکے نے جس کو راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھنے میں مزا آتا تھا۔ ذیل کا واقعہ بیان کیا۔

"میں جب بمبئی گیا تو وہاں سڑکوں پر ان گنت لڑکیاں دیکھ کر میری طبیعت بہت خوش ہوئی کیونکہ ان میں سے اکثر اپنی کلائیوں پر گھڑی باندھتی تھیں۔ ایک روز کا ذکر ہے، ناگ پاڑہ میں جہاں یہودیوں کی آبادی ہے، فٹ پاتھ پر میں نے ایک پارسی لڑکی دیکھی۔ بڑی تیز قدمی سے وہ سامنے باٹلی والے ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی گوری گوری کلائی پر کالے تسمے کے ساتھ گھڑی بندھی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا جو میں نے چٹکیوں میں طے کر لیا۔ اس سے دو قدم آگے نکل کر میں دفعتہ مڑا۔" تمہاری گھڑی ماں ٹیلا واگا؟" میں نے اس سے گجراتی زبان میں وقت پوچھا۔ اس نے اپنی کلائی اونچی کی تو گھڑی ندارد۔" ماری گھڑیاں کاں چھے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔ میری

گجراتی ختم ہو گئی ۔ میں نے اسے ہندوستانی میں جواب دیا۔ "آپ کی گھڑی مجھے کیا معلوم کہاں ہے۔" صاحب اس نے تو چلانا شروع کر دیا۔ ایک تو گجراتی زبان، اس پر اس پارسی لڑکی کا چیخ چیخ کر بولنا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گھڑی میں نے چند منٹ پہلے اس کی کلائی پر دیکھی تھی، پر اب ایک دم خدا معلوم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ برابر کہے جا رہی تھی "تم لے گئے ہو، یعنی تم نے ہی لی ہے" اور میں اسے بے سود یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا "میں نے آپ کی گھڑی نہیں لی ہے۔ اگر میں نے آپ کی گھڑی لی ہوتی تو آپ سے وقت ہی کیوں پوچھتا۔ اس کو بھی چھوڑیئے میں نے گھڑی آپ کی کلائی سے کیسے اتاری؟"

اس کا شور سن کر فٹ پاتھ پر کئی یہودی اور کرسٹان جمع ہو گئے۔ میں ان میں گھر گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ کبھی میں انگریزی میں اپنی بے گناہی ثابت کرتا کبھی ہندوستانی میں۔ مگر سب اسی کے طرفدار تھے۔ میں سخت گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ میں ان سب سے کہہ دوں "تم جاؤ جہنم میں۔ نہیں مانتے تو نہ مانو" کہ میری نگاہ سڑک پر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کالا فیتا نظر آیا۔ کالے فیتے کے ساتھ گھڑی بھی لٹک رہی تھی۔ میں چلایا۔ "وہ دیکھو، اس بچے کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

سب سے پہلے اس لڑکی نے بچے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میری گھڑی"۔

بچے کے ہاتھ میں گھڑی اسی کی تھی۔ ایک بڈھی یہودن نے بڑھ کر اس بچے سے گھڑی لی اور اس پارسی لڑکی کو دے دی۔ میں نے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی اس لئے کہ اس وقت میں اپنے آپ کو ہیرو سمجھ رہا تھا۔

اس لڑکے نے جس کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیاں چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں، یہ واقعہ بیان کیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ ہم انہیں چھیڑیں۔ اس واقعے سے جو میں اب بیان کرنے والا ہوں، آپ اس کی تصدیق کر سکیں گے۔ آج سے ڈھائی برس پہلے کا ذکر ہے جب میرے خیالات آج سے مختلف تھے۔ ان دنوں مجھ پر کسی سے عشق کرنے کی دھن سوار تھی، چنانچہ ہر وقت اداس اداس رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سارے وجود پر ایک ناقابلِ بیان اضمحلال طاری ہے۔ یہ اُداسی اور یہ اضمحلال اس روز بہت ہی زیادہ بڑھ گیا جب مجھے اپنے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ وہ ـــ گلی میں ایک لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ اس کے عشق کی داستان سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ اس قدر رشک آیا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اب میں نے ارادہ کر لیا کہ ہر روز اس گلی سے گزرا کروں گا اور اسی لڑکی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ارادہ میں نے اس لئے کیا کہ میری نظر میں کوئی ایسی لڑکی تھی ہی نہیں جس سے اس قسم کا رشتہ پیدا کیا جا سکتا ہو ــــ سو جناب، میں پندرہ بیس روز تک متواتر ایک ہی وقت پر اس گلی میں سے گزرتا رہا۔ وہ لڑکی اس دوران میں مجھے کئی بار نظر آئی۔ ہر مرتبہ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر بات اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

ایک روز دوپہر کو جب کہ گلی بالکل خالی تھی، میں ادھر سے گزرا۔ جب میں موڑ مڑا تو مسجد کے پاس دفعتاً ایک برقعہ پوش عورت مجھے نظر آئی۔ میں جب اس کے پاس سے گزرا تو اس نے برقعے سے ہاتھ نکال کر میرا بازو پکڑ لیا اور بلند آواز میں کہا۔

"کیوں وے کُشتیا، توں ہر روز ایدھر دے پھیرے کیوں کرنا ایں؟"

اس کا مطلب یہ تھا کہ آوارہ گرد کہیں کے تو ہر روز یہاں کے پھیرے کیوں کرتا رہتا

ہے — میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بخدا، میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا میں بمشکل یہ کہہ سکا "نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو کبھی ادھر سے نہیں گزرتا۔"

وہ ہنسی۔ برقعے کی جالی میں سے اس کی آنکھیں مجھے نظر آئیں۔ میرا خوف دُور ہو گیا۔ میں نے اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے کولھے پر اس زور سے چٹکی بھری کہ وہ بلبلا اٹھی "اللہ کرے مر جائیں — تیرا کچھ نہ رہے" — اس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کرے تو مر جائے۔ تیرا کچھ باقی نہ رہے — میرا سب کچھ باقی رہا، وہ بھی باقی رہی اس لئے کہ میرا خوف دُور ہو گیا تھا اور اس کی خفگی نہ رہی۔

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ——— کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی ——— قطع تعلق بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ عداوت بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ عجیب و غریب مضمون ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد اور عورت کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ عورت کی طرف مرد کا میلان سمجھ میں آجاتا ہے لیکن مرد کی طرف عورت کا میلان جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے سمجھ سے کچھ اونچا ہی رہتا ہے۔ یعنی عورت مرد سے نفرت بھی کرتی ہے اور انجام کار اس سے محبت بھی کرتی ہے۔ اس کی بدعنوانیوں کی مذمت کرتی ہے مگر اس کے باوجود ان بدعنوانیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

شادی ہی کو لیجئے جو کہ بہت عام چیز ہے۔ چاہئے تو یہ کہ لڑکی اپنی شادی پر خوش ہو۔ لیکن ہونے والی دلہنوں کو کس نے گھٹڑی بنتے نہیں دیکھا۔ رونی آواز میں ان کے منہ سے ایسی باتیں کس نے نہیں سنیں۔ میری جوتی کو کیا غرض پڑی تھی۔ جو میں چق میں سے ان کو جھانک کر دیکھتی ——— میں تو انہیں ہاتھ تک نہ لگانے دوں ——— مفتوں کی ہاتھ لگ گئی ہوں جبھی تو اپنے دوستوں میں میری یوں ہتک کی گئی ہے ——— آگ لگے میری

جان کو۔۔۔ نہیں بھئی میں تو عمر بھر کنواری رہوں گی ۔۔۔ امی جان نے تو اپنے سر کی بلا ٹالی ہے ۔۔۔ جانے کون ہیں کون نہیں ہیں، گھر لے جاتے ہی مجھے قتل کر دیں ۔۔۔ اتنا پڑھایا لکھایا تھا کیا اسی دن کے لئے کہ مجھے ایک نامحرم آدمی کے حوالے کر دیا جائے ۔۔۔ میں زہر کھالوں گی ۔۔۔ لڑکیاں پرایا دھن ہوتا ہے، بس یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے ۔۔۔ چار روز سے میرے منہ میں ایک کھیل تک نہیں گئی۔ کسی کو ترس نہیں آتا ۔۔۔ نہیں میں یوں نہیں بیٹھوں گی ۔۔۔ مجھ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ نہاؤ، سجو، بنو ۔۔۔ یہ سجا بنا کر مجھے کس کے حوالے کیا جا رہا ہے ۔۔۔ میری بھتی کھائیے، مجھے ہائے ہائے کر کے پیٹئیے اگر میری شادی کیجیے ۔۔۔۔۔"

آنکھوں میں سے آنسو بہتے ہیں۔ کئی کئی دن واقعی کھانا نہیں کھایا جاتا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھوں پر مہندی لگوائی جاتی ہے، ڈھولک بجانے والی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا جاتا ہے۔ گیتیں اڑائی جاتی ہیں اور تخلیے میں اپنی سب سے عزیز سہیلی کے ساتھ کپکپی پیدا کرنے والی باتیں کی جاتی ہیں۔ آزمودہ نسخے نوٹ کئے جاتے ہیں آنے والے حادثے کی تفصیلات ادھر ادھر سے اکٹھی کی جاتی ہیں اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔ کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔

مہندی لگے ہاتھ، مقیشی بال ۔۔۔ ٹس ٹس کرتے بھاری جوڑے، چمکیلے زیور، چہرے کی اُڑی اُڑی رنگت، ریشمی گھونگھٹ، دل میں دھڑکنیں۔ شہنائیاں ۔۔۔ باجے گاجے۔ دھوم دھڑکے ۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد حجلۂ عروسی ۔۔۔۔۔۔ خاموشیوں کے قفل جو کبھی کھلیں ہی نہیں۔ ادھر یکسر انکار، ادھر کبھی التجائیں، منتیں، خوشامدیں اور کبھی دھمکیاں "لو اب خدا کے لئے مان بھی جاؤ ۔۔۔ دیکھو ہم تم سے کبھی نہ بولیں گے ۔۔۔

کچھ منہ سے تو بولو۔۔۔ قسم لے لے جو تمہیں پھر گدگداؤں، ایک فقط تم ہاں کر دو ــــ خدا کی قسم میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔۔۔۔۔ لو میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔۔۔۔ تم اب بھی نہیں مانتیں۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ بھئی میں تو تھک گیا ہوں آخر ہمیں تھوڑی دیر آرام بھی تو کرنا ہے۔۔۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔۔۔۔ خاموشی تکلم میں تبدیل ہوئی ”نہیں آپ اپنے دوستوں کو ضرور ساری بات بتا دیں گے۔۔۔۔ مجھے کہیں کا نہ رکھیں گے۔۔۔۔ آپ کو خدا کی قسم جو آپ نے کچھ کہا۔۔۔۔ ہائے، میں کیسی بے حیا ہوں۔۔۔ آپ دل میں کیا کہتے ہوں گے چٹاخ پٹاخ باتیں کر رہی ہے ــــ خدا کرے مجھے موت آ جائے۔۔۔۔۔ ضرور دروازے کے باہر کوئی کھڑا ہے ــــ اب میں کیا کروں۔۔۔۔ زبردستی نہ کیجئے۔۔۔ میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔ آپ کتنے بے رحم ہیں ــــ دیکھئے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیجئے۔۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔۔۔۔ مجھے بخش دیجئے۔ صرف آج کے روز بخش دیجئے، پھر آپ جو کہیں گے میں مان لوں گی۔۔۔۔“

ایسی باتیں کون مانتا ہے۔ آخر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ــــ ہر جوان لڑکی سے جلد یا بدیر یہی سانحہ پیش آتا ہے۔ مردوں کی بدعنوانیوں کے متعلق ساری شکائتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ایک ہی رات میں وہ تمام منزلیں طے کر لی جاتی ہیں جن کے متعلق سوچنا بھی کبھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔

شادی کے دوسرے روز ہی وہ مرد جس کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا، عزیز ترین رفیق بن جاتا ہے۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ تم سیدھی مانگ نکالا کرو ــــ صبح سے کہیں باہر گئے ہیں، ابھی تک لوٹے نہیں، اللہ خیر کرے ــــ یہ سلیپنگ سوٹ انہوں نے مجھے دیا

ہے۔ کہتے تھے رات کو سوتے وقت دوسرے کپڑوں کی بجائے اب اسے ہی پہنا کرو ـــــ نہیں بھئی میں پان نہیں کھاؤں گی۔ انہوں نے منع کیا تھا ـــــ ان کو آج تک کبھی وقت پر چائے نہیں ملی تھی۔ جب میں نے یہ سنا تو خدا کی قسم میرے دل کو بہت دکھ ہوا ـــــ صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہی کیا کہ ان کے لئے چائے بنوائی۔ ....."

میں سمجھتا ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک رات حائل ہے۔ اگر یہ کالی چیز حائل نہ ہوتی تو خوباں سے چھیڑ چھاڑ کبھی پردۂ ظہور پر نہ آتی۔ بہت ممکن ہے کہ مرد چھیڑتے وقت اس رات کو بھول جاتا ہو مگر عورت جب چھیڑتی ہے یا جب کسی عورت کو چھیڑا جاتا ہے تو یہ رات جھٹ اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

سارا فساد اسی رات کا ہے جس نے انسانی زندگی کو کتنی خوبصورت روشنیوں سے متعارف کرایا ہے۔ چھیڑ چھاڑ انہی روشنیوں میں سے ایک روشنی ہے، جسے پھلجھڑی کہنا بجا ہوگا۔ میں اس کے متعلق پچھلے مضمون میں نوجوان مردوں کے تاثرات بیان کر چکا ہوں۔ اس مضمون میں نوجوان لڑکیوں کا ردِ عمل بیان کیا جائے گا۔

یہ ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے میں نے ذیل کا سوالیہ تیار کیا۔

۱۔ مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ـــــ آپ اسے پسند کرتی ہیں یا ناپسند؟ ـــــ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی وجہ بیان کیجئے۔

۲۔ جب آپ کو چھیڑا جاتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں؟

۳۔ آپ کو کیوں چھیڑا جاتا ہے؟

۴۔ کیا آپ مردوں کو نہیں چھیڑتیں؟

۵۔ کوئی ایسا واقعہ بیان کیجئے جو اس چھیڑ چھاڑ سے متعلق ہو اور جس کا تاثر ابھی تک آپ

کے حافظے پر قائم ہو۔

ظاہر ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں سے براہِ راست یہ سوال کرنے اور ان کا جواب حاصل کرنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی ہوگی۔ مخصوصاً کنواری لڑکیوں سے تو میں نے ڈرتے ڈرتے یہ سوال کئے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ان دقتوں اور مشکلوں کے باوجود یہ مضمون تیار ہو ہی گیا۔

عورتوں اور لڑکیوں کے تاثرات اور ان کا ردِ عمل بیان کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک جگہ تمام لڑکیوں اور عورتوں کو بلا کر میں نے یہ معلومات حاصل نہیں کیں۔ مجھے تین بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے لاہور، بمبئی اور دہلی، ان تین شہروں میں مختلف اوقات پر میں ایک ایک دو دو عورتوں سے ملا۔ ان سے دوستانہ بات چیت کی اور اپنے مطلب کی باتیں معلوم کر لیں۔

کُل بارہ عورتوں سے میرا اس قسم کا انٹرویو ہوا جن میں سے دو بیاہی ہوئی تھیں۔ باقی سب کنواری تھیں۔ ان کی عمر کا اوسط سولہ سال سے زیادہ نہیں تھا۔

نو لڑکیوں نے جن میں دو بیاہی ہوئی بھی شامل تھیں، پہلے سوال کا بالکل ایک جیسا جواب دیا۔ مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسی فضول اور نازیبا حرکت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ پرائی بہو بیٹیوں کو چھیڑنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ صریحاً شہدا پن ہے۔ اس قسم کی حرکت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اخلاقِ حمیدہ سے عاری ہوتے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں شرم کا پانی بھی نہیں ہوتا۔ ہم اس چھیڑ چھاڑ کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتیں بلکہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، اس لئے کہ ہماری آزادی میں یہ بے شمار رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ غضب خدا کا ہم ڈر کے مارے باہر سیر کو

بھی تو نہیں جا سکتیں۔ باغ میں گھومنے کے لئے جائیے تو ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ کوئی مردود ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دے گا اور ایسی بھوکی نظروں سے دیکھے گا کہ سیر کا سارا لُطف، سارا مزا کر کرا ہو جائے گا۔ کسی پھول کی طرف دیکھئے تو جھاڑی کے عقب سے کن سُری آواز آئے گی "انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا۔ چلیں ہیں سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی" سیرِ گل گئی بھاڑ میں اور زخمی گئے چولہے میں۔ کہاں کی سیرِ گل، کہاں کی شوخی۔ یہ لگوڑے کچھ کرنے بھی دیں۔ یہ موئی چھیڑ چھاڑ ہے یا گندی موری کے چھینٹے۔ کوئی پکچر دیکھنے جاؤ تو سب کی گردنیں ہماری طرف مڑ جائیں گی۔ گھورے جا رہے ہیں، سب گھورے جا رہے ہیں۔ بات تک کرنے کی اجازت نہیں۔ اندھیرا ہوتا ہے تو اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ اپنی ٹانگ کھجلانے کے بہانے ساتھ والے لالہ جی ہماری ٹانگ کھجلانا شروع کر دیں گے۔ پکچر ختم ہونے پر باہر نکلتے وقت یہ اندیشہ لاحق رہے گا کہ کوئی صاحب کندھا مار کر نکل جائیں گے اور انگریزی میں افسوس کا اظہار کر دیں گے ــــ کوٹھے پر بال سکھانے کے لئے جاؤ تو کوئی ہمسایہ اپنے چڑھے ہوئے پتنگ کی ڈور ڈھیل کر کے بالوں میں اُلجھا دے گا۔ غصے میں آکر ڈور پکڑلو تو آواز آئے گی "لے لیجئے جتنی درکار ہے" بھنا کر ڈور کھینچنا شروع کی تو انھوں نے چرخی ہاتھ میں لے لی۔ کھینچتے جائیے جب تک آپ تھک نہ جائیں۔ کیا کریں کیا نہ کریں ہم تو بہت عاجز آ گئے ہیں..... ایک دُکھ ہو تو بتائیں ــــ شاپنگ کے لئے جائیں تو اور مصیبتیں سر پر کھڑی ہوتی ہیں۔ دکاندار ہی آنکھیں سینک رہے ہیں اور اپنی حرص پوری کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی فقرہ بھی چُست کر دیتا ہے۔ "کشمیر کے سیب ادھر بھی دیکھتے جائیے ــــ انڈرویئر کے نئے نئے ڈیزائن آئے ہیں۔ ملاحظہ فرماتے جائیے ــــ ایک نظر ادھر بھی۔ بالکل نیا مال

ہے ...... " اب ان مردوں سے کوئی کیا کہے۔ جی تو اکثر یہی چاہتا ہے کہ اپنی چھتری ان ملعونوں کے حلق میں گھونس دیں یا ہینڈ بیگ منہ پر دے ماریں مگر بے کار کے فضیحتے سے ڈر لگتا ہے اس لئے مجبوراً خاموش رہنا پڑتا ہے —— کوئی موٹر پاس سے گزرتی ہے تو اس کے اندر بیٹھے ہوئے تمام صاحبان گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ حضرت یہ آپ کو کیا خبط سمایا۔ آپ کی موٹر جا رہی ہے، ہم بھی جا رہے ہیں، اس نظر بازی کا فائدہ!

—— موٹر والوں کو چھوڑیئے، یہ کم بخت ٹوکریا والے مزدور (جنہیں دہلی میں جھلّی والے اور بمبئی میں پاٹیا والے کہتے ہیں) بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے "میم صاحب، لائیے یہ پارسل میں اٹھاؤں —— یہ مرتبان مجھے دے دیجئے، میں اٹھا لیتا ہوں" —— ان سے کہا جاتا ہے "نہیں بھائی، میں اتنی چھوٹی چیز کے لئے مزدور نہیں چاہتی" جواب ملتا ہے۔ "میم صاحب میں آپ سے پیسے تھوڑے ہی مانگتا ہوں" اب بتائیے ان اُلو کے پٹھوں کو کیا جواب دیا جائے۔ سو سو آفتوں میں ہر وقت جان پڑی رہتی ہے —— کوئی ٹھکانا ہے اس عذاب کا۔ خدا کرے نہ رہیں ایسے لوگ اس دنیا کے تختے پر۔ ناک میں دم کر رکھا ہے نابکاروں نے —— چھیڑ چھاڑ کو ناپسند کرنے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی لغو اور بیہودہ حرکت ہے کہ جس کا سر ہے نہ پیر ہمیں آخر کیا سمجھ لیا گیا ہے۔

ان نو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا "مجھے اس چھیڑ چھاڑ سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی چوہوں سے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ——

ایک اور نے کہا "میں اس لئے یہ چھیڑ چھاڑ ناپسند کرتی ہوں کہ عورت اس کا جواب چپت مارنے یا گالی دینے کے سوا کسی اور طریقے سے دے ہی نہیں سکتی۔ ظاہر ہے

کہ یہ دونوں چیزیں ہم سے نہیں ہو سکتیں، اسی واسطے ہم اس سے نفرت کرتی ہیں
راہ چلتے چھیڑا جائے تو اور بھی مصیبت ہے۔ اب کیا بیچ بازار کے تو تُو میں میں شروع
کر دی جائے۔ اصل میں عورت شروع سے دبی ہوئی ہے۔ اس لئے بیچاری کچھ بھی نہیں
کر سکتی ورنہ ایسے بدنیت مردوں کا علاج ہو سکتا ہے۔"

باقی تین لڑکیوں میں سے دو نے اسی سوال کے جواب میں کہا۔ "ہمیں یہ چھیڑ چھاڑ
ناپسند نہیں مگر وہ چھیڑ چھاڑ یقینی ناپسند ہے جو بالکل تہذیب سے گری ہوئی ہو۔ یعنی
جس میں انتہا درجے کا بھونڈا پن ہو۔ آنکھیں مارنا، کندھے رگڑنا، سلام کرنا، دور سے
اشارہ بازی کرنا، فحش مذاق کرنا، یہ سب ہمیں ناپسند ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک
آنکھ میچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ چھیڑنے کا یہ طریقہ بہت ہی بازاری اور عامیانہ ہے۔
اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ "کیوں، تمہاری کیا صلاح ہے؟" یہ مذاق
نہیں بلکہ ایک نہایت ہی ادنیٰ کاروباری سوال ہے۔ ایسا بھدا اشارہ ہے جو خوش ذوق
آدمیوں کو ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں بنیا پن ہے اور کندھے رگڑنا یا
دھکے مارنا اکھاڑوں میں ہونا چاہئے۔ چھیڑ چھاڑ کشتی گیری نہیں اور بھئی کیا پتہ ہے۔ دھکے
سے کوئی اوندھے منہ گر پڑے، کوئی جوڑ نکل جائے، کوئی ہڈی ٹوٹ جائے۔ ہنسی میں
کھنسی ہو جائے اور جناب سلام کا تو کوئی مطلب ہی نہیں۔ یہ کیا ہے کہ بار بار ہاتھ جوڑے
جا رہے ہیں۔ ماتھے کی طرف ہاتھ لے جایا جا رہا ہے۔ اس فعل میں قابلِ رحم بچپن ہے۔
فحش مذاق کے متعلق کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ مذاق شستہ ہونا چاہئے، کوئی اس میں
بات ہو نہ کہ صرف چھیڑنے کی خاطر چھیڑ دیا جائے۔ کوئی پتھر اٹھا کر سر پر مار دیا جائے۔
پسلیوں میں ٹھوکا دے دیا جائے۔۔۔۔ کوئی ذائقہ دار بات ہونی چاہئے جس سے دل و دماغ

کو فرحت حاصل ہو۔ شگفتگی سی پیدا ہو۔ آدمی ایک دو گھڑی کے لئے خوش ہو جائے ایسی چھیڑ چھاڑ ہمیں پسند ہے اور خدا کرے کہ یہ ہمیشہ جاری رہے۔ اس سے بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ جوانی کی داستان میں اس قسم کے چٹکلے ضرور ہونے چاہئیں یہ نہ ہوں تو کہانی بالکل خشک اور بے مزہ ہو گی۔"

ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے یہ بھی کہا۔ "بدصورت اور کریہہ المنظر مردوں کو تو چھیڑنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اگر وہ چھیڑنا ہی چاہتے ہیں تو ایسی عورتوں کو منتخب کیا کریں جوان کا جوڑ ہوں یا بدصورتی میں اُن سے کچھ زیادہ ہی نمبر لیتی ہوں۔ بدصورت مردوں کا خوش شکل عورتوں کو چھیڑنا میرے نزدیک ایک بہت بڑا جرم ہے۔ میں خوبصورت[1] نہیں ہوں لیکن وہ صدمہ جو خوش شکل عورتوں کو ایسے مردوں کی چھیڑ چھاڑ سے ہوتا ہے اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔"

بارھویں یعنی آخری لڑکی نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ "مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق میرا خیال بہت اچھا ہے۔ مجھے یہ چیز پسند ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں بہت شریر ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مرد مجھے چھیڑیں تاکہ جواب میں ان کو میں بھی چھیڑ سکوں۔ وہ عورتیں جو سمجھتی ہیں کہ ہم مردوں کو چھیڑ ہی نہیں سکتیں، بیوقوف ہیں۔ وہ سوچتی ہی نہیں کہ مردوں کو اتنی سہولتیں میسر نہیں جتنی کہ ہمیں ہیں۔ ہمارا جوابی حملہ انہیں بوکھلا سکتا ہے، ان کی ہستی گم کر سکتا ہے۔ انہیں لاجواب کر سکتا ہے اس لئے کہ ہم عورتیں ہیں۔ ان کو اس کا ہر حالت میں لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ مرد عورت کو کمزور، کم زبان اور کم عقل سمجھتا اس کے اس نظریے سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ عورت کمزور سہی لیکن وہ کم زبان

[1] یہ لڑکی خوبصورت تھی

اور کم عقل تو نہیں۔ اپنی عقل اور اپنی زبان سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کے مقابلے میں ہم عورتیں کہیں زیادہ ذہین اور طباع ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو مردوں کی زبان بند کر سکتی ہیں۔ ان کی ساری چالاکی ختم کر سکتی ہیں ــــ عورت کے سامنے مرد حیثیت ہی کیا رکھتا ہے۔ عورت سے دور مرد سب کچھ ہے۔ پر جب وہ عورت کے سامنے آتا ہے تو کشکول اٹھانے والا بھکاری بن جاتا ہے کیونکہ عورت سے وہ سوائے خیرات کے اور مانگتا ہی کیا ہے۔ مرد کے لئے عورت بہت دلچسپ چیز ہے، عورت کے لئے مرد بھی کم دلچسپ چیز نہیں اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسی دلچسپ چیز خدا نے پیدا ہی نہیں کی ــــ اکثر عورتیں مرد کو ان آنکھوں سے دیکھتی ہیں جن سے وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو دیکھنے کی عادی ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ سب مرد، باپ اور بھائی تو نہیں ہوتے۔"

دوسرے سوال کا جواب پہلی نو میں سے پانچ لڑکیوں نے اس طور پر دیا "ہم نفرت سے منہ پھیر لیتی ہیں۔ یا دل ہی دل میں ان کو کوس کر خاموش ہو جاتی ہیں۔"

نو میں سے باقی چار لڑکیوں نے کہا "اگر اکیلی ہوں یعنی ساتھ کوئی مرد نہ ہو تو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی ساتھ مرد ہو تو اس کی مدد لے لی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ساتھ والے مرد اکثر یہی کہا کرتے ہیں "تمہیں شرم نہیں آتی ــــ کیا تمہاری ماں بہن نہیں ہے۔" یوں شرم دلانے پر ہماری تسلی ظاہر ہے کہ خاک بھی نہیں ہوتی مگر کیا کیا جائے، سر بازار جھگڑا کرنے سے تو ہم رہیں!"

ان چار لڑکیوں میں سے ایک نے کہا "نہیں بابا میں تو خاموش نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی مرد میرے ساتھ ایسی حرکت کرے تو میں لڑنے مرنے پر اتر آتی ہوں۔ مجھ میں ذرہ بھر برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ میں گالیوں کا تانتا باندھ دیا کرتی ہوں اور کیا

مجال ہے کہ چھیڑنے والا چوں بھی کر جائے۔ شریف عورتوں سے دل لگی کرنا خالہ جی کا گھر تو نہیں۔ اور بھئی اپنے دل کی بھڑاس تو ضرور نکال لینی چاہئے۔ چاہے اس میں اپنی بدنامی ہی کیوں نہ ہو۔

اسی سوال کا جواب باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار یوں دیا۔

۱۔ اگر چھیڑ چھاڑ شستہ اور تہذیب کے دائرے کے اندر ہو تو میں مسکرا دیا کرتی ہوں بس ذرا سی مسکراہٹ جس سے صرف داد کا اظہار ہو، ہونٹوں اور آنکھوں میں پیدا کی اور چل دیئے۔ مردوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیئے کیونکہ زیادہ منہ لگانے سے یہ اکثر بگڑ جاتے ہیں۔ اگر کسی نے تہذیب سے گرا ہوا مذاق کیا تو حقارت کے آثار چہرے پر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والا یقینی طور پر عورت کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے، جب اسے اپنی حماقت کا جواب مل جاتا ہے تو دل ہی دل میں خجل ہو کر ایک طرف سمٹ جاتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مرد خواہ کتنا ہی ذلیل ہو اس کے اندر شرم و حیا کا مادہ ضرور ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی عورت ان کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ ضرور شرمندہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ اگر چھیڑ چھاڑ نہایت ہی عامیانہ اور بازاری قسم کی ہو تو میں نہ چھیڑنے والے کی طرف غور کرتی ہوں نہ اس کے فعل کی طرف۔ ایسے بد ذوق لوگوں کو اہمیت دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ خوش ذوق مردوں کی چھیڑ چھاڑ کی رسید ضرور دینی چاہئے۔ صرف رسید، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بدشکل مردوں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب میں اپنی زبان نکال کر یا ٹھینگا دکھا کر دیا کرتی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نفرت اور حقارت کا کوئی اور اچھا ذریعہ اظہار مل جائے مگر ٹھینگا دکھانے سے زیادہ آسان، بااثر اور قریب ذریعہ اظہار

مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ دراصل کہنا یہ ہوتا ہے "یہ منہ اور مسور کی دال --- ذرا آئینے میں رُخِ مبارک تو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے [illegible] نہایت بھونڈے پن سے جوڑنے کی کوشش کی ہے" بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ خود بخود ٹھینگا ان کی جانب اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دل کو تھوڑی سی تسکین حاصل ہو جاتی ہے --- یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ انگوٹھے کو ان جذبات سے کیا تعلق ہے۔

۳۔ میں مرد کے ہر حملے کا جواب دینے کی قائل ہوں خواہ وہ کتنا ہی اوچھا کیوں نہ ہو میں چاہتی ہوں کہ ہر عورت اسے اپنا اصول بنا لے۔

تیسرے سوال یعنی "آپ کو کیوں چھیڑا جاتا ہے" کے جواب میں پہلی نو لڑکیوں اور عورتوں نے کہا۔ بانے ہماری بلا --- بُری عادت جو ہوئی۔ جن لوگوں کے اخلاق بگڑ جائیں ایسی حرکتیں ہی تو کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر ان کا دماغ جوتوں سے پلپلا کر دیا جائے تو آئندہ کبھی ان کو جرأت نہ ہو۔

باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار اس سوال کے جواب میں یہ کہا۔

۱۔ ہم عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف پردہ حائل ہے۔ اس شفاف پردے میں سے مرد اکثر ہماری طرف تعجب آمیز دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی چیزیں خواہ مخواہ دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ ہم شیشے کی الماریوں میں رکھی ہوئی نمائشی چیزیں ہیں مگر لطف یہ ہے کہ ہمیں ان الماریوں میں خود مردوں ہی نے بند کر رکھا ہے۔

۲۔ جس بنچ پر یہ لکھا ہو "روغن گیلا ہے" اس کو انگلی سے چھو کر ضرور دیکھا جائے گا۔

جس دیوار پر حکمِ اقتناعی لکھا ہو "یہاں اشتہار لگانے منع ہیں"۔ اس پر اشتہار ضرور چسپاں کئے جائیں گے۔ جس راستے "یہ شارع عام نہیں" کا بورڈ لگا ہو۔ اس راستے سے لوگ ضرور گزریں گے ـــ عورت بھی ایک قسم کا گیلا روغن ہے، وہ دیوار ہے جس پر اشتہار لگانا منع ہے یا وہ سڑک ہے جس پر "یہ شارع عام نہیں" کا بورڈ لگا ہے۔

۳۔ ہمیں اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ ہم چھیڑنے کی چیز ہیں۔ اگر مرد ہمیں نہ چھیڑیں تو کسے چھیڑیں ـــ گھوڑیوں کو؟

چوتھا سوال یہ تھا: کیا آپ مردوں کو چھیڑتی ہیں؟ اس کا جواب میں نے پہلی تو لڑکیوں سے پوچھنا مناسب خیال نہ کیا۔

باقی تین لڑکیوں میں سے پہلی دو نے کہا۔ ہم نے آج تک اس معاملے میں کبھی پہل نہیں کی۔ دراصل ہم ڈرپوک ہیں۔ کئی دفعہ جی چاہا ہے کہ چھیڑ خانی کی جائے مگر ہمت نہیں پڑی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ پہل مردوں ہی کی طرف سے ہونی چاہیئے؟

آخری لڑکی نے کہا: کیوں نہیں۔ میں ضرور چھیڑتی ہوں۔ جب موقعہ ملے چھیڑتی ہوں، اگر موقعہ نہ ملے تو موقعہ پیدا کر لیتی ہوں۔ موقعے پیدا کرنے عورت کے لئے کیا مشکل ہیں۔ مرد کو تو موقع کی تلاش میں گھنٹوں ضائع کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے اندر جرأت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ ساری اونچ نیچ پر غور کرنا پڑتا ہے۔ مگر عورت یہ ابتدائی مرحلے طے کئے بغیر اپنا کام کر سکتی ہے۔ مرد کے چہرے پر ان ابتدائی تیاریوں کے آثار نظر آجاتے ہیں، یعنی وہ کچھ مضطرب سا، کچھ بے وقوف سا دکھائی دیتا ہے۔ جونہی یہ آثار نظر آئیں عورت کو فوراً اپنا پستول چلا دینا چاہیئے۔ اس کی ساری تیاریاں دھری کی

دھری رہ جائیں گی۔ میں تو اکثر یہی کیا کرتی ہوں۔ یوں میں نے کئی فنکاری شکار کرنے سے پہلے شکار کئے ہیں۔

آخری سوال کے جواب میں پہلی نو لڑکیوں اور عورتوں میں سے صرف چار مندرجہ ذیل واقعات بیان کر سکیں۔

ایک نے کہا۔ میں اسکول میں پڑھتی تھی اور ہر روز تانگے پر جاتی تھی۔ ایک دن میں نے تانگہ سٹیشنری کی دوکان پر ٹھیرایا کیونکہ مجھے کوہِ نور پنسل لینا تھی۔ مجھے معلوم نہیں، سائیکل پر ایک لڑکا میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جب میں نے پنسل نکالنے کے لئے دوکاندار سے کہا تو وہ جھٹ سے آگے بڑھا اور دکاندار سے کہنے لگا "ایک پنسل کوہِ نور میرے لئے بھی۔" دوکاندار دو پنسلیں نکال کر لے آیا۔ "کتنے پیسے؟" اس لڑکے نے پوچھا۔ دکاندار نے جواب دیا "ساڑھے تین آنے"۔ لڑکے نے پنسل پھینک دی اور کہا "تم نے تو اندھیر مچا رکھی ہے۔ دوسری دکان پر یہ پنسل تین آنے میں ملتی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آیئے میں آپ کو وہ دکان دکھا دوں" میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے سائیکل کے پیڈل پر پیر رکھا اور کوچوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے چل پڑا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ دکاندار واقعی بہت گراں فروش ہے ضرور اس پنسل میں یہ دو پیسے زیادہ منافع لے رہا ہے۔" چنانچہ تانگہ اس لڑکے کی سائیکل کے پیچھے پیچھے چلا۔ تھوڑی ہی دور چل کر وہ سائیکل پر سے اترا اور مجھ سے کہنے لگا "یہ دکان ہے" پھر اس نے دکاندار سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ کہا "مولوی صاحب کوہ نور کی دو پنسلیں نکال لیجئے گا"۔ دوکاندار فوراً دو پنسلیں نکال کر لے آیا۔ اس پر لڑکے نے مجھ سے کہا "اس کو تین آنے دے دیجئے"۔ میں نے تین آنے ادا کر دیئے۔ لڑکا

سامنے اسکول میں داخل ہو گیا اور میں آگے چل دی۔ اسکول جا کر میں نے ایک سہیلی سے بات کی۔ اس نے کہا: "کوہ نور کی پنسل تو ہر جگہ ساڑھے تین آنے میں ملتی ہے اس دکاندار نے تین آنے میں کیسے دے دی۔" میں نے کہا: "تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اس سے لے دوں گی۔" اسکول کا ٹائم ختم ہونے سے پہلے پہلے چار لڑکیاں میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ ہم سب اس دکان پر گئیں۔ میں نے چار پنسلیں ان کو اسی دام پر لے دیں۔ دوسرے روز چھ میں نے اپنے بھائی جان کے لئے خریدیں۔ شام کو جب میں اپنی استانی کے لئے بارہ پنسلیں خریدنے کے لئے اس دکان پر پہنچی تو دکاندار نے کہا "وہ صاحب جو اس روز آپ کے ساتھ آئے تھے چھ آنے جمع کرا گئے تھے، ایک پنسل انہوں نے لی تھی، اس کے پورے دام انہوں نے دے دیئے تھے۔ گیارہ پنسلیں آپ نے لیں۔ تین آنے کے حساب سے، چھ آنے میں سے جو انہوں نے یہ کمی پوری کرنے کے لئے جمع کرائے تھے، دو پیسے باقی بچتے ہیں۔ آپ ایک پنسل لے جا سکتی ہیں۔۔۔ یہ سن کر مجھے بے حد شرم آئی اور غصہ بھی بہت آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے یہ شرارت کیوں کی۔ یہ واقعہ اسی وجہ سے مجھے اب تک یاد ہے۔"

دوسری نے کہا: "۔۔۔ میرے پیٹ میں تھا۔ ہم لوگ پہلی مرتبہ قطب دیکھنے گئے تھے۔ وہ آگے آگے تھے اور میں آہستہ آہستہ ان کے پیچھے سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ ایک اندھیرا تھا، دوسرے میری طبیعت خراب تھی۔ قدم پھونک پھونک کے رکھنا پڑتا تھا۔ دم پھول رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ ان تمام مصیبتوں کے باوجود میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آخری منزل تک ضرور پہنچوں گی خواہ راستے ہی میں دم نکل جائے لیکن دوسری منزل تک پہنچتے پہنچتے میری طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ مجھے دیوار کا سہارا لے کر رکنا

پڑا۔ دو نوجوان لڑکے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا "اگر قطب الدین ایبک کو اس بات کی خبر ہوتی تو ناڑھ کے بجائے اس نے یقیناً میٹرنٹی ہوم تعمیر کرایا ہوتا ——— دانت بیس کر رہی تو رہ گئی۔ ان اللہ کے ماروں کو مذاق بھی کب سوجھتا ہے۔"

تیسری نے کہا "پتا جی کی تبدیلی لاہور ہوئی تو ہم نے ——— میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنا شروع کیا۔ سردیوں کا موسم آیا تو میں پہلی مرتبہ دھوپ سینکنے کے لئے کوٹھے پر چڑھی۔ سامنے ہی ایک اور کوٹھا تھا۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے مجھ کو دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا چنانچہ میں نے فوراً آواز دی۔ "ماتا جی!" لڑکے نے جب یہ آواز سنی تو جوڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے اور بازو پھیلا کر ورزش شروع کر دی۔ باہوں کے بعد اس نے ٹانگوں کی ورزش کی اور دس منٹ کے بعد مجھے دیکھتا ہوا نیچے اتر گیا۔ اس کی اس دلچسپ حرکت پر مجھے بے حد ہنسی آئی۔ اس واقعے کو چار برس گزر چکے ہیں مگر جب کبھی میں اس لڑکے کے بستہ ہاتھوں کا تصور کرتی ہوں جو میرے "ماتا جی" کہنے پر ورزشی انداز میں کھل گئے تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔"

چوتھی نے کہا "ہم ہر روز اسکول سے فارغ ہو کر ایک قطار میں واپس آیا کرتی تھیں۔ اسکول پرائیویٹ قسم کا تھا۔ ہمارے ساتھ ہیڈ ماسٹر بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اسی طرح ہم واپس آ رہی تھیں کہ ہال بازار میں ہماری چار لڑکوں سے مڈبھیڑ ہوئی جو غالباً ہاکی کھیلنے جا رہے تھے۔ کیونکہ ہر ایک کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے ہم سب کو گھور گھور کے دیکھا۔ ہم میں کچھ بہت چھوٹی بھی

تھیں۔ ان کی طرف اس نے غور نہ کیا۔ جو جوان تھیں ان کو اس نے بلند آواز میں گننا شروع کر دیا۔ "ایک ــ دو ــ تین ــ چار ..." ہیڈ ماسٹر صاحب، یہ دیکھ کر فوراً آگے بڑھے۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے" لڑکے نے جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات سنی ہی نہیں، کہنے لگا "پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس ..... دس گول ..... ہاف ٹائم میں دس گول کون یقین کرے گا" ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دل میں سوچا ہو گا کہ چلو اچھا ہوا جو اس نے میری بات نہ سنی ورنہ خواہ مخواہ جھگڑا ہو جاتا ــ مجھے اس لڑکے کی یہ چالاکی کبھی نہیں بھولے گی۔ بات کا کانٹا بدلتے وقت اس کے چہرے پر مجال ہے جو ذرہ بھر گھبراہٹ نظر آئی ہو۔"

باقی تین لڑکیوں نے آخری سوال کے جواب میں ترتیب وار ذیل کے واقعات بیان کیے۔

ا۔ یہ بمبئی کی بات ہے۔ میں اور میری سہیلی دونوں بس میں ماہم کا میلہ دیکھنے جا رہی تھیں۔ موسم بہت اچھا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم بالائی منزل پر تھیں۔ اس لیے ہوا کے جھونکے خوب مزا دے رہے تھے۔ جب بس دادر کے پل پر چڑھی تو ادھر ادھر ریلوے لائنوں کا ایک جال سا بکھرا نظر آیا۔ میرے اس طرف دوسری رو میں ایک خوش شکل لڑکا بیٹھا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور اپنے ساتھی سے کہا "ہاتھی۔ سفید ہاتھی" میں نے اپنی سیٹ پر سے ذرا اٹھ کر اس طرف دیکھا۔ مگر مجھے ہاتھی نظر نہ آیا۔ اس پر اس لڑکے نے مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا "اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں ــ" بات بڑی معمولی ہے مگر یہ واقعہ میرے دل و دماغ

میں ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو چکا ہے۔ اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں"۔ اس گورے چٹے لڑکے نے یہ فقرہ ایسے دلکش انداز میں کہا کہ میں بے حد متاثر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مصنوعی شاعرانہ پن تھا۔ چہرے پر ایک عجیب قسم کی قلندرانہ متانت تھی۔ پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو تبسم پیدا ہوا اس میں اچھی بنی ہوئی چائے کی سی گھلاوٹ تھی۔

سردیوں کا موسم تھا۔ رگوں میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں ہمارا ایک دور کا رشتہ دار ملازمت کی تلاش میں آیا اور کچھ دیر ہمارے پاس ٹھہرا۔ یہ لڑکا جس کی عمر بائیس برس کے قریب ہوگی۔ اچھے ڈیل ڈول کا تھا۔ بھرا بھرا جسم جو کسی حد تک موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ گال سرخ۔ رنگ سفید جیسا کہ عام طور پر کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ دودھ پینے کا بہت قائل تھا۔ آتے ہی اس نے امی جان سے کہا "آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی مگر میں ناشتے پر ایک گلاس دودھ اور دو کچے انڈے ضرور پیا کرتا ہوں۔ کھاتا بھی خوب ہوں"۔

اس کو ورزش کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ صبح اٹھ کر ڈمبلوں سے اکسرسائز کرتا تھا اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے نہانا فخر سمجھتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا "اتنی سردی میں ٹھنڈے برف پانی سے نہانا کیا ضروری ہے۔ اور پھر ہر روز" اس نے جواب میں اپنی چھاتی چوڑی کرتے ہوئے کہا "مجھے تو بالکل سردی محسوس نہیں ہوتی خدا جانے آپ لوگوں کے دانت کیوں بجتے رہتے ہیں۔ ادھر میری طرف دیکھئے صرف ایک قمیص پہنے ہوں، نیچے بنیان بھی نہیں۔ بہت زیادہ سردی ہو تو چند دنوں کے لئے یہ تکلف کرنا پڑتا ہے ورنہ کبھی نہیں"۔

تین چار روز تک اس نے ہم سب پر اس طرح رعب گانٹھا۔ جب ملازمت نہ ملی تو مایوس ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کچھ چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ مجھے چونکہ ہر روز نہانے سے اور دودھ پینے سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے میں نے اس سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں، میں بیان کرنا نہیں چاہتی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہم نے ایک رات کوٹھی کے باہر اصطبل میں ملنا طے کر لیا۔ اب کچھ اصطبل کے متعلق۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جسے ابا جی اصطبل کہا کرتے ہیں۔ اس میں ایک عدد گائے بندھی رہتی ہے۔ رات کے بارہ بجے یعنی مقررہ وقت پر وہ اپنے کمرے سے کھسک کر اصطبل کے پاس آگیا۔ میں بھی کسی نہ کسی طریقے سے وہاں پہنچ چکی تھی۔ جونہی وہ آیا میں نے اسے اصطبل کے اندر داخل کر دیا۔ "آپ کچھ دیر یہاں کھڑے رہیں میں کوٹھی کے اندر جا کر اپنا اطمینان کر آؤں۔ ممکن ہے کوئی جاگتا ہو۔"

اُس نے جب گائے کو دیکھا تو ٹھٹکا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو تو اس کے دودھ سے بہت پیار ہے۔ ڈرتے کیوں ہیں میں ابھی آئی۔" میں نے اس کو اندر داخل کیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

صبح چھ بجے کے قریب اتفاقاً جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اس کا دھیان آیا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوڑی دوڑی گئی۔ کواڑ کے ایک سوراخ سے میں نے اندر دیکھا۔ وہ گائے کا کالا اور کھردرا کمبل اوڑھے گلے پر بیٹھا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس سے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ میں نے واپس آنے کی بہت کوشش کی مگر امی جان نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ انہیں بہت سردی لگ رہی تھی۔ میں کیسے آپ سے معافی مانگوں۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔"

اس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔ شکر ہے کہ گھر میں کسی کو اس واقعے کی خبر نہ ہوئی۔ آٹھ بجے کے قریب اس نے نوکر کو بلایا اور کہا "آج میں گرم پانی سے نہاؤں گا۔" پھر نو بجے جب ناشتہ چنا گیا تو اس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا "نہیں آج چائے پیوں گا۔"

مجھے اس قدر مسرت حاصل ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اب اس سے میری باقاعدہ خط و کتابت جاری ہے۔

۳۔ دو برس پہلے کی بات ہے جس کا میری شرارت پسندیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں تو میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن یہ واقعہ جو میں اب بیان کروں گی ایسا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں بہت شریر ہوں حاضر جواب تو بلا کی ہوں۔ میں کبھی پریشان نہیں ہوئی تھی لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ جب مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو عجیب و غریب لطف کا احساس ہوا۔ جیسا کہ آپ کو واقعے کے بیان سے معلوم ہو گا۔ میری پریشانی کا باعث کسی مرد کی چالاکی یا ہوشیاری نہیں تھی بلکہ محض ایک حادثے کی وجہ سے مجھے بے حد خفیف ہونا پڑا۔

میں نے ٹریم میں کبھی سفر نہیں کیا تھا لیکن مجبوراً ایک روز مجھے اس میں سوار ہونا پڑا۔ مجھے جلدی دفتر پہنچنا تھا۔ بس آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ٹریم سامنے کھڑی تھی۔ چنانچہ میں اس میں بیٹھ گئی۔ میرے سامنے ایک بہت ہی موٹا پارسی بیٹھا تھا۔ اس کی توند اس قدر بڑھی ہوئی تھی اور اس کی گردن جس پر کلف لگا کالر چڑھا تھا اس قدر موٹی تھی کہ اگر وہ نیچے فرش کی طرف دیکھنا چاہتا تو اسے لیٹنا پڑتا۔ مجھے سخت زکام ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریشمی رومال تھا جس سے میں بار بار اپنی ناک صاف

کر رہی تھی۔ جب ٹریم چلی تو لال باغ کے قریب ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا۔ رومال میرے ہاتھ سے اڑا اور اس موٹے پارسی کی ران پر جا گرا۔ کچھ دیر تک میں نے دل ہی دل میں کئی طریقے یہ رومال حاصل کرنے کے لئے سوچے۔ یہ بھی خیال آیا کہ اسے مخاطب کر کے کہوں "میرا رومال گر گیا ہے، براہِ مہربانی مجھے دے دیجئے" لیکن سوچا کہ وہ گردن جھکا کر کیسے دیکھ سکے گا۔ میں خود اس کو بتا کر وہاں سے رومال اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ چپ چاپ آنکھ بچا کر دو انگلیوں کی مدد سے بالکل آہستگی کے ساتھ اسے اٹھا لوں گی۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار اس ڈر کے مارے کہ ٹریم میں بیٹھا ہوا کوئی اور آدمی دیکھ لے گا۔ مجھے اپنا ہاتھ کھینچنا پڑا۔

مجھے غیر معمولی طور پر مضطرب دیکھ کر پارسی کو ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں کچھ گڑبڑ ہی ہے۔ مجھے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے دیکھ کر کئی مرتبہ اسے بھی اپنی اکڑی ہوئی گردن موڑ کر باہر جھانکنا پڑا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ میں اس رومال کو وہیں چھوڑ دیتی اور بازار سے ایک اور خرید لیتی مگر وہ ایک دوست کا تحفہ تھا اس لئے مجھے بے حد عزیز تھا۔ میں نے آخری بار ارادہ کر کے جب ہاتھ اس طرف بڑھایا تو پارسی بے چین ہو گیا۔ میں اس کی طرف خدا معلوم کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کو اب پکا یقین ہو گیا کہ میرے اضطراب کا باعث اس کا کوئی ایسا نقص ہے جس سے وہ ابھی تک غافل ہے۔ اس نے بڑی دقت سے اپنی گردن جھکائی۔ موٹے موٹے گدگدے ہاتھ رانوں پر ادھر ادھر پھیرے ایک ہاتھ کے نیچے میرا رومال آیا۔ ایک دم اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ جلدی سے بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے انگلیوں کی مدد سے میرے اس ننھے سے رومال کو اپنی پتلون

کے اندر داخل کر لیا۔ کم بخت نے یہ خیال کیا کہ اس کی قمیص کا دامن باہر نکلا ہوا ہے اُدھر اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا ادھر میرا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پہ شرم محسوس کرتے رہے۔ میں تو اس حادثے کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ جونہی ٹریم ٹھیری میں اس پارسی کی طرف دیکھے بغیر اتر گئی۔

میں اس واقعے کو قریب قریب بھول چکی تھی کہ چھ یا سات مہینے کے بعد کرافورڈ مارکیٹ کے پاس جب کہ میں ایک دکان سے بھنا ہوا پستہ لے رہی تھی ایک خوش پوش نوجوان میرے قریب آیا۔ اس نے اپنی جیب میں سے باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک چیز نکالی اور مجھ سے کہا "معاف فرمائیے گا۔ آپ کی ایک چیز گم ہو گئی تھی جو مجھے مل گئی۔ آج حاضر کر رہا ہوں"

میں نے باریک کاغذ کھول کر دیکھا تو میرا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔۔۔ وہی رومال تھا جو اس موٹے پارسی نے اپنی پتلون میں داخل کر لیا تھا۔۔۔ مجھے بے حد شرم محسوس ہوئی۔ غصہ بھی بہت آیا۔ تھوڑی سی ہنسی بھی آئی اور میں حیران ہوں کہ ایک دم میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔۔۔۔ شاید اس لئے کہ میں نے اس نوجوان کو اب پہچان لیا تھا۔ ٹریم میں یہ اس روز دور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔۔۔۔ مجھے کوئی بات نہ سوجھی۔۔۔۔ ٹھیک طور پر میں اپنے کھسیانے پن کا بھی اظہار نہ کر سکی۔

دیہاتی بولیاں

آیئے! آپ کو پنجاب کے دیہاتوں کی سیر کرائیں۔ یہ ہندوستان کے وہ دیہات ہیں، جہاں رومان تہذیب و تمدّن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے، جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ یہاں کا عشق ایسا سونا ہے جس میں مٹی ملی ہوئی ہے تصنّع اور بناوٹ سے پاک ان دیہاتوں میں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کو شاعری نظر آئے گی جو اوزان کی قید اور لفظی بندشوں سے بالکل آزاد ہے۔

یہاں کی کھلی ہوائیں آپ چلیں پھریں گے تو آپ اپنے اندر ایک نئی زندگی پائیں گے، آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ بھی عشق کر سکتے ہیں، آپ کے اندر بھی پھیل کر والہانہ وسعت اختیار کر لینے کی قوت موجود ہے آپ بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں، اور ہواؤں کی گنگناہٹ آپ کے لئے بھی کچھ معنی رکھتی ہے جب ابابیلیں خاموش آسمان میں ڈبکیاں لگاتی ہیں اور شام کو چمگادڑیں قطار اندر قطار جنگلوں کی طرف تیرتی ہیں اور گاؤں واپس آنے والے ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو بجتے ہیں اور فضا پر ایک عجیب ناچ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو آپ کا دل

بھی کبھی پھیلے گا اور کبھی سکڑے گا۔

وہ دیکھئے ، سامنے کچے کوٹھے زمین پر لیٹے ہوئے ہیں ۔ دیواروں پر بڑے بڑے اُپلوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے ۔ مٹی کے یہ گھروندے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کیونکہ ان میں فاصلہ نہیں ۔ ایک کوٹھا دوسرے کوٹھے سے ہمکنار ہے ۔ اسی طرح اس کھلے میدان پر ایک اور کھلا میدان بن گیا ہے ۔ ان کوٹھوں پر چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں ۔ گنّے کے لمبے لمبے چھلکے جابجا بکھرے ہوئے ہیں ۔ دوپہر کا وقت ہے ۔ دھوپ اتنی تیز ہے کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دے ۔ فضا ایک خوابگوں اداسی میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ کبھی کبھی کسی چیل کی باریک چیخ اُبھرتی ہے اور خاموشی پر ایک خراش سی پیدا کرتی ہوئی ڈوب جاتی ہے ..... مگر اس تیز دھوپ میں یہ کوٹھے پر کون چڑھا ہے ...... ارے ، یہ تو کوئی اس گاؤں کی مٹیار (نوجوان لڑکی) ہے ۔ دیکھو تو کس انداز سے تنے ہوئے کوٹھے پر ننگے پیر چل رہی ہے ۔ یہ لو وہ کھڑی ہو گئی ۔ اسے کس کا انتظار ہے ۔ اس کی آنکھیں کس کو ڈھونڈھ رہی ہیں ۔ ببولوں کے جھنڈ میں یہ کیا دیکھ رہی ہے ۔ کب تک یہ ایسے کھڑی رہے گی ۔ کیا اس کے پیر نہیں جلتے شاید اسی نے یہ کہا ہوگا :-

کوٹھے اپر کھلیاں میری سڑ گیاں پیر دیاں تلیاں ۔

میرا یار نظر نہ آوے

(ترجمہ :- میں کوٹھے پر کھڑی ہوں اور یوں کھڑے کھڑے میرے پیر کے تلوے جل گئے ہیں — لیکن میرا عاشق نظر نہیں آتا)

نہیں اس نے تو گنّے کے سوکھے ہوئے چھلکے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے ہیں ....

لیکن یہ پھر بار بار ادھر کیوں دیکھتی ہے جدھر بوڑھے برگد کے سامنے تلے ایک نوجوان ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے کھڑا ہے ...... کیا یہ اس کا "وہ" تو نہیں؟.... اس کی لاٹھی پر پیتل کے کوکے کتنے چمک رہے ہیں!

ہم ادھر نوجوان کی طرف دیکھتے رہے اور اُدھر آخری کوٹھے پر جو کہ یہاں سے کافی دُور ہے ایک اور نوجوان لڑکی نمودار ہو گئی۔ دُور سے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا مگر اس کی ناک کی لونگ کتنی چمک رہی ہے۔ کیا اسی لونگ کے بارے میں یہ کہا گیا تھا:۔

تیرے لونگ دا پیا لشکارا   ہالیاں نے ہل ڈک لئے

(ترجمہ:۔ تیرے لونگ (ناک کی کیل) نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اپنے ہل روک لئے (اس خیال سے کہ بجلی چمک رہی ہے اور بارش آ رہی ہے)

ابھی نہیں یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے ...... یہ دیکھئے، ادھر کی لڑکی اس لڑکی کو اشارہ کر رہی ہے۔ شاید اسے آنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ پھر اس طرف بھی جھک کر دیکھتی ہے جہاں گاؤں کا وہ نوجوان آدمی سائے تلے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی پکڑے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑے ہوئے تعویذوں سے کھیل رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ "بولی" یاد آ جاتی ہے جو اس گاؤں کے تمام لڑکوں کو یاد ہے۔ کیا ہے؟ ...... ہاں ....

منڈا موہ لیا تویتاں والا   دمڑی دا سک مل کے

(ترجمہ:۔ ایک تگڑے جوان کو جس نے آفات سے محفوظ رہنے کے لئے تعویذ پہن رکھے تھے، ایک لڑکی نے دمڑی کا سک (اخروٹ یا کسی اور درخت کی چھال جس سے ہونٹ رنگے جاتے ہیں) مل کر موہ لیا)

پھر اشارے ہو رہے ہیں۔ ادھر کی لڑکی اُسے جلدی آنے کے لئے اشارہ کر رہی ہے..... صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی:۔

کوٹھے کوٹھے آ کچھیے   تینوں بنتو دا یار دکھاواں

(ترجمہ:۔ کوٹھے کوٹھے چلی آ الچھی..... میں تجھے بنتو کا عاشق دکھاؤں)

کیا پتہ ہے کہ یہ نوجوان جو برگد کے سائے تلے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے بنتو ہی کا عاشق ہو۔ بنتو کا نہ ہو گا تو کسی اور کا ہو گا۔ کیونکہ بہرحال اسے کسی کا تو عاشق ہونا ہی چاہئیے۔ دیکھئے کس انداز سے کھڑا ہے۔ سر پہ سفید کھادی کا صافہ باندھ رکھا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر اہم سمجھ رہا ہے۔ اس کو دو نوجوان لڑکیوں نے اس حالت میں دیکھ لیا ہے، اب سارے گاؤں کی کنواریوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سر پہ سفید کھادی کا صافہ باندھ کہ وہ برگد کے سائے تلے کھڑا تھا۔ کیا کیا باتیں نہ ہوں گی۔ پھبتیاں اڑائی جائیں گی۔ اور کنوئیں پر دیر تک ہنسی اور قہقہوں کے چھینٹے اُڑتے رہیں گے۔ اور کیا پتہ ہے کہ کوئی شریر چھوکری اونچے سُر میں یہ گانا شروع کر دے۔

سِر بَنّھ کے کھدر دا صافا   چندرا شوقین ہو گیا

(ترجمہ:۔ سر پہ کھادی کا صافہ باندھ کر بے چارہ شوقین ہو گیا ہے)

یہ چھوکری جب ہنسے گی تو اس کے دانتوں میں ٹھکی ہوئی سونے کی کیلیں بھی ہنسیں گی اور کیا پتا ہے کہ وہاں پاس ہی کسی جھاڑی کے پیچھے کوئی شریر لونڈا چھپا بیٹھا ہو وہ یہ ہنستی ہوئی کیلیں دیکھ لے اور اٹھ کر جب کھیتوں کا رخ کرے تو دفعتہً اس کے ہونٹ وا ہوں اور یہ بولی پرندے کی طرح پھر سے اُڑ جائے۔

موج سنیارا لے گیا   جنہیں لائیاں دنداں وچ میکھاں

(ترجمہ: معزہ تو وہ سنیارا لے گیا جس نے تمہارے دانتوں میں یہ کیلیں جڑیں)

یہ لڑکا جب کھیتوں سے لوٹ کر گاؤں آئے گا اور شام کو چوپال پہ حقے کے دور چلیں گے تو وہاں وہ سفید سلفے والا بھی ہوگا۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کنوئیں پہ پانی بھرنے کے دوران میں کس ظالمانہ طریق پر اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے تو وہ افسردہ اور مغموم ہو جائے گا، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کو اپنی معشوقہ کی بے رخی ستاتی رہے گی، ایک آہ کی صورت میں آخر کار اس کے سینے میں یہ الفاظ اٹھیں گے۔

کلا ٹکریں تے حال سناواں   دکھاں وِچ پے گئی جندڑی

(ترجمہ:۔ اس میں اپنے کسی دوست کو یا اپنے ہی آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اگر تم مجھے اکیلے میں ملو تو میں تمہیں سارا حال سناؤں۔ میری زندگی دکھوں سے گھر گئی ہے)

بہت ممکن ہے، وہ اپنے کسی دوست کو ہمدرد جان کر حالِ دل کہے اور یوں اپنے دل کا غبار ہلکا کرے مگر اتفاق ایسا ہو کہ ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے اور جس کو اس نے اپنا ہمدرد بنایا تھا اسے سارے گاؤں میں نشر کر دے اس پر یہ کوئی ضرور کہے گا۔

یاری وِچ نہ وکیل بنائیے   لڑ کے دس دؤ گا

(ترجمہ: عشق میں کسی کو وکیل نہ بنانا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس سے لڑائی ہو گئی۔ تو وہ سارا بھید کھول دے گا۔)

پھر نامراد عاشق یہ سمجھ کر کہ اس کا عشق ناکام رہا ہے۔ ہل چلاتے ہوئے دوپہر کی اداس دھوپ میں یکا یک بول اٹھے گا۔

میری لگ دی کسے نہ دیکھی　　　تے ٹٹ دی نوں جگ جان دا

(ترجمہ:۔ جب میری اور اس کی محبت ہوئی تو کسی کو پتا تک نہ چلا۔ مگر اب کہ یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے، ساری دنیا کو معلوم ہو گیا ہے اور جگ ہنسائی کا باعث ہوا ہے)

لیکن کیا پتا ہے کہ دوسری طرف اس کی معشوقہ کو بھی کچھ کہنا ہو، کیا پتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہو اور ظاہر نہ کر سکتی ہو، کیونکہ یہ بول اس کے منہ سے بغیر کسی وجہ کے تو نہیں نکلیں گے۔

یار سی سرو دا بوٹا　　　ویڑھے وِچ لا رکھدی

(ترجمہ:۔ یار میرا کیا تھا سرو کا درخت تھا، بس اسے اپنے صحن میں اگا چھوڑتی)

اتنے میں فوج کی بھرتی شروع ہو جانے گی اور اس کا یہ سرو قد یار لام پر چلا جائے گا۔ اس کی دنیا سونی ہو جانے گی۔ جب برسات آئے گی۔ پیپل کے درختوں میں جھولے پڑیں گے۔ آم کے درختوں پر پپیہے پیہو پیہو پکاریں گے۔ کوئلیں کوکیں گی۔ سارا گاؤں خوش ہو گا تو وہ .... وہ اپنے گھر کی گیلی منڈیر کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ کر پکارے گی۔

بول وے نمانیاں کاواں　　　کوئلاں کُوک دیاں

(ترجمہ:۔ اے نمانے کوّے تو ہی بول، کوئلیں کُوک رہی ہیں۔ کوّا اگر بولے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی عزیز آنے والا ہے

میدان خالی ہونے پر اس گاؤں میں ایک اور عاشق بھی پیدا ہو جائے گا۔ وہ ہر روز اس امید پر اس کے گھر کے پاس سے گزرے گا کہ ایک روز وہ اسے ضرور بلائے گی اور اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کار

وہ تنگ آکر کہے گا:۔

کدی چندریئے ہاک نہ ماری چوڑے والی بانہہ کڈھ کے

(ترجمہ:۔ لفظ چندری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اردو میں اس کے لئے کوئی مترادف لفظ مجھے نہیں ملا۔ چندری پنجابی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی ہمدردی کے طور پر اس کو گفتگو میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں محبت اور شکایت دونوں اس میں حل ہیں۔ وہ اس کو چندری سے مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کبھی اپنے چوڑے (ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چوڑیوں کا ایک گروہ جو کلائی سے لے کر کہنی تک دیہات کی عورتیں پہنتی ہیں) والا بازو باہر نکال کر مجھے اشارہ نہیں کیا۔ مجھے اپنے پاس نہیں بلایا)

ایک زمانہ گزر جائے گا۔ عشق کی داستان فسانہ بن جائے گی اور آخر ایک روز یہ دیہاتی حسینہ کسی کے ساتھ بیاہ دی جائے گی۔ اس کے بیاہ پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی۔ لوگ اس کا اور اس کے خاوند کا مقابلہ کریں گے اور کوئی نوجوان چیخ اٹھے گا۔

منڈا روہی دی کِکر دا جا تو ویاہ کے لے گیا چندر و دی

(ترجمہ:۔ روہی دی کِکر" ایک خاص قسم کے ببول کو کہتے ہیں جس کی لکڑی بڑی کرخت اور کالی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرد جو کہ روہی کے ببول کی طرح کھردرا اور کالا تھا چاند جیسی دلہن بیاہ کرلے گیا ہے !!)

پہلی رات آئے گی۔ ہزاروں کپکپاہٹیں اپنے ساتھ لئے۔ ایک پلنگ پر دلہن گٹھڑی بنی ہوئی اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑے گی اور اپنے آمادۂ ظلم خاوند سے

منت بھرے لہجے میں کہے گی :۔

بینوں اجّدی رات نہ چھیڑیں مہندی والے ہتھ جوڑدی

(ترجمہ :۔ مجھے صرف آج کی رات نہ چھیڑو۔ دیکھو میں اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔)

کیا وہ مان جائے گا ؟ کیا جوڑے ہوئے حنا آلود ہاتھ اس ظالم کے دل میں رحم پیدا کر دیں گے ؟ ۔ خیر اس قصّے کو چھوڑ دیتے ۔ یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جائے گا اور دلہن پرانی ہو جائے گی ، پھر جھگڑے شروع ہوں گے اور ایک روز اس کا خاوند اس کے پہلے عاشق کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس وقت سینے پر پتھر رکھ کر خاموش تو ہو جائے گی مگر اکیلے میں اس کے منہ سے یہ بول نکلیں گے ۔

میرے یار نوں مندا نہ بولیں میری بھانویں گُت پٹ لئیں

(ترجمہ :۔ میری تم چٹیا جڑ سے اکھیڑ لو ، مگر میرے یار کو بُرا نہ کہو)

اور ..... اور پھر ..... یونہی عمر بیت جائے گی ۔ اور یہ فسانہ اس دیہات میں نئے فسانے پیدا کرے گا ۔

دیہاتی بولیاں

پنجاب کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بنجاروں کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عورتیں عام طور پر اپنے سنگھار کا سامان انہی بنجاروں سے خریدتی ہیں۔ دیہاتی زندگی میں بنجارے کو اپنے پیشے اور اپنی چلتی پھرتی دکان کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ دیہاتی گیتوں اور بولیوں میں اس کا ذکر عام ہے چونکہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتا اس لئے اسے بے وفائی کی تجسیم بنا دیا گیا ہے مجھے اس وقت کوئی ایسا گیت یاد نہیں آ رہا جس میں بنجارے کا ذکر ہو مگر چند بول میرے ذہن میں گونج رہے ہیں جو میں نے خدا معلوم کہاں اور کب سنے تھے۔

او ونجارا، کہلا ونجارا ـــــ اور یار کوارا

ساڈے او ہان دا ـــــ ٹھگ ونجارا

مطلب:- وہ بنجارا، وہ کہلا بنجارا ـــــ وہ ہمارا کنوارا یار ہمارا ہم عمر ہے وہ ٹھگ بنجارا ـــــ یہ شاید ایک کنواری لڑکی کے جذبات ہیں جس میں دوشیزہ محبت کے اتار چڑھاؤ بڑی پیاری لہروں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بنجارے کانچ کی رنگ برنگ چوڑیاں بھی لاتے ہیں جو دیہات کی کنواریاں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔ چوڑیاں چڑھانے میں یہ بنجارے بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ پارے کی طرح مچلتی ہوئی کلائیوں میں بھی بڑی پھرتی سے کانچ کی کھنکھناتی ہوئی چوڑیاں یوں چٹکیوں میں چڑھا دیتے ہیں۔ وہ کس انداز سے دیہات کی نوجوان لڑکیوں کی انگلیاں چٹخاتے ہیں اور کس انداز سے اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہیں۔ اس کا تصور آپ خود کیجئے ..... میرے تصور میں وہ جوان لڑکی ہے جس نے نیلی چوڑیاں پہنی ہیں، اس کی سانولی باہنوں میں یہ چوڑیاں دیکھ کر آسمان بھی نکھر گیا ہے ..... لڑکی بڑے چاؤ سے بار بار اپنی چوڑیوں کو داد بھری نگاہوں سے دیکھتی جا رہی ہے۔ ادھر کھیتوں کی طرف جہاں کپاس اُگ رہی ہے، ببولوں کے جھنڈ میں سے دفعتاً اس کا عاشق نکلتا ہے اور دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے جانے کیا بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں۔ نوجوان اس کو سخت ہاتھوں سے پکڑنا چاہتا ہے۔ مگر وہ مچھلی کے مانند اس کی گرفت سے پھسل جاتی ہے۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے مگر فوراً ہی مصنوعی سنجیدگی اختیار کر کے کہتی ہے ؂

اساں نویاں چڑھایاں چوڑیاں
ہتھاں تے نہ ماریں ویریا

مطلب: ہم نے یہ چوڑیاں نئی نئی پہنی ہیں ـــ دیکھو ہمارے ہاتھوں پر نہ مارنا۔

ہنسی مذاق ختم ہوتا ہے۔ لڑکی جس کا نام بنتو ہے۔ بار بار اپنی آنکھ ملتی ہے

اس کا چاہنے والا اس سے پوچھتا ہے۔ کیا ہوا بنتو تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے؟

وہ آنکھ مل کر کہتی ہے "تنکا پڑ گیا ہے"

اس پر حاسد عاشق کہتا ہے :۔

کیہڑے یار دا گُنّا واکیتا اکھ وِچ ککھ پے گیا۔

مطلب :۔ تو نے کس یار کے لئے گائے بھینسوں کا چارہ تیار کیا ہے کہ تیری آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہے۔

تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد میلے کی بات چیت ہوتی ہے۔ بنتو کا دوست بڑے ٹھاٹ سے بیساکھی کے میلے پر جا رہا ہے گلے میں سونے کا یہ موٹا کنٹھا (زیور) پڑا ہے قمیص دھاری دار کپڑے کی ہے، جس سے شہری شب خوابی کا لباس بناتے ہیں۔ ہاتھ میں نئی لاٹھی ہے جس کو تیل پلایا گیا ہے۔ چرچر کرتا جوتا ہے۔ بالکل نیا جس نے ابھی سے کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ جب میلے جانے کے لئے سب لوگ نکلیں گے تو یہ جوتا اس کی لاٹھی سے بندھا ہوگا۔ اس کے پاس ایک چھاتا بھی ہے۔ جو گاؤں میں اور کسی کے پاس نہیں، اس لئے وہ اسے ضرور ساتھ لے کر جائے گا۔ بارش نہیں تو کیا۔ شان تو بڑھ جائے گی۔

میلے کا سن کر بنتو کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے :۔

میلے چلیاں تے لیا دیں پہنچی   وے لے جا میرا گٹ من کے

مطلب :۔ تو میلے پر جا رہا ہے تو میرے لئے ایک پہنچی ضرور لانا ــــ لو میری کلائی کا ناپ لیتے جاؤ۔

ستانے کے لئے وہ انکار کر دیتا ہے۔ ہم تمہارے کیا ہوتے ہیں کہ تمہاری

روز روز کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں۔ نہیں ہم تمہارے لئے میلے سے کچھ نہیں لائیں گے۔"

تھوڑی دیر چخ پخ ہوتی ہے، آخر بنتو ملامت آمیز لہجے میں تھک ہار کر اپنے دوست سے کہتی ہے:۔

میری اک نہ منّی کمجاتا   تیریاں میں لکھ منّاں دی

مطلب:۔ کم ذات تُو نے میری یہ ایک چھوٹی سی بات نہیں مانی اور میں تو تیری لاکھوں باتیں مانتی ہوں۔

اس پر ازراہِ مذاق بنتو کا دوست اس سے کہتا ہے "کیوں؟ —— بس؟ —— یہ تو وہی ہوا......

کچی یاری لڈواں دی۔ لڈو مک گئے یرانے ٹٹ گئے

مطلب:۔ لڈوؤں کی دوستی ------ (یعنی وہ دوستی جس میں چیزوں کا لین دین ہو) کچی ہوتی ہے —— لڈو ختم ہو گئے اور دوستی بھی ختم ہو گئی۔

یہ سُن کر بنتو کے احساس کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور ایک دم اس کے سینے سے آہ اُٹھتی ہے وہ سوچتی ہے:۔

کی کھٹیا ای عشق گل لا کے   جندڑی نوں روگ لا لیا

مطلب:۔ عشق کو گلے لگا کر یعنی محبّت کر کے تو نے کیا فائدہ حاصل کیا ہے سوائے اس کے کہ اپنی جان کو ایک روگ لگا لیا ہے —— عشق کرنے سے پہلے کیا اس کے کانوں نے بار بار نہیں سنا تھا......

کتے ڈب نہ مریں انجانا وے   عشقے دی نہر وگدی

مطلب :۔ اے انجان تو کہیں ڈوب نہ مرے۔ تیرے آگے عشق کی نہر چل رہی ہے۔

اس کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ مگر پھر بھی وہ عشق میں گرفتار ہو گئی اور ہر وقت بَن ٹھن کے رہنے لگی ——— ابھی تھوڑے ہی روز ہوئے اس نے محلے کے رنگریز سے کہا تھا:۔

چُنّی رنگ دے للاریا میری — وے السی دے پُھل ورگی

مطلب: ملے رنگریز میرا دوپٹہ رنگ دے۔ ایسے رنگ میں جو اَلسی کے پھول کی طرح ہو (اَلسی کے پھول کا رنگ بہت خوبصورت ہوتا ہے)

اور اس کا عشق کتنا صادق تھا۔ جس روز اس نے یہ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے تو اس کو کتنا دُکھ ہوا تھا اور جب چوتھے روز دھان کے کھیتوں میں بنتو کی اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا:۔

تیری میری اک جندڑی — تینوں تاپ چڑھے میں ہُونگاں

مطلب :۔ تیری میری اک جان ہے یعنی یک جان و دو قالب والا معاملہ ہے۔ تجھے بخار چڑھے تو میں ہنکارے بھرتی ہوں۔

سوچتے سوچتے وہ اپنے دوست کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔ . . . . .

میرا کالجا گنڈے دے چھِل ورگا — ویکھیں یارا پاڑ نہ سُٹیں

مطلب :۔ میرا کلیجہ پیاز کے چھلکے کی طرح نازک ہے، دیکھنا کہیں اسے چیر پھاڑ نہ دینا۔

یہ کہہ کر وہ بیری کے پاس بیٹھ کر زار و قطار رونا شروع کر دیتی ہے ۔ اس کا عاشق جس نے صرف چھیڑنے کی خاطر اسے لڈّوؤں کا طعنہ دیا تھا، سخت پریشان ہوتا ہے ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ۔ وہ اس کو ہزار دلاسا دیتا ہے ۔ مگر وہ روئے جاتی ہے ۔ معافیاں مانگتا ہے مگر اس کے آنسو نہیں تھمتے ۔ بھئی میں نے کیا کہا ہے جو تمہارے آنسو ہی بند نہیں ہوتے ۔ کوئی مجھ سے خطا ہو گئی ہو تو معاف کر دو ۔۔ لو اب چپ ہو جاؤ ۔ غصے کو تھوک دو ۔۔ حد ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے بھئی کچھ تو خیال کرو ۔ کوئی یہاں آ نکلے تو کیا سمجھے ۔ ۔ ۔ ۔ بس اب چپ ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ہوا کیا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے ۔"

وہ روئے جاتی ہے اور اس بات پر اڑ جاتی ہے ۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رووّاں ۔۔۔۔ تے دُکھ تینوں نہیوں دسنا

مطلب :۔ تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی پر یہ نہیں بتاؤں گی کہ مجھے دکھ کیا پہنچا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عاشق کے لئے یہ کتنا بڑا دکھ ہے ۔ بنتو سامنے بیٹھ کے روئے جا رہی ہے ۔ پر یہ بتانے کے لئے تیار نہیں کہ اسے کیا دکھ پہنچا ہے ۔ اس سے بڑھ کر روحانی سزا وہ اپنے عاشق کو اور کیا دے سکتی ہے ۔

چند روز کے بعد یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جاتی ہے کہ بنتو اور اس کے عاشق کا آپس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے ۔ چنانچہ طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں ۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے ۔ لوگ بنتو کے عاشق کو طعنے دیتے ہیں ۔ چنانچہ وہ بنتو کو مخاطب کر کے کہتا ہے :۔

کی کچّٹے تیری یاری   مہناں مہنا ہو کے مُٹّ گئی

مطلب:۔ اے "خام عورت" (کچّی یعنی وہ عورت جو عشق کرنے کے معاملے میں بالکل نا تمام ہو) تیری دوستی بھی کیا تھی جو طعنہ طعنہ ہو کر ٹوٹ گئی۔

ایک روز بنتو نے اُسے دُور کٹے ہوئے درختوں کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا اس کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔

یاری توڑ کے کھُنڈاں تے بے گیاں تے مَیں تُو کیہڑا رب ہو گیاں۔

مطلب:۔ دوستی ختم کر کے تو مجھ سے دور کٹے ہوئے درختوں کی جڑوں پہ بیٹھ گیا ہے، لیکن تو ایسا کرنے سے خدا تو نہیں ہو گیا۔

درختوں کی ٹنڈ منڈ جڑوں پر ایسے کئی خدا دیہاتوں میں بیٹھے رہتے ہیں جن کی خدائی آن کی آن میں اوندھی ہو جاتی ہے..... آسمانوں والا خدا اوپر بیٹھ کر یہ تماشا دیکھتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

تحدیدِ اسلحہ

بین الاقوامی سیاست اتنی پیچ دار اور الجھی ہوئی ہے کہ اس کو سمجھنا کام رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

تحدیدِ اسلحہ کے متعلق آپ نے بیسیوں مرتبہ اخباروں میں پڑھا ہوگا مگر سچ کہیئے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا سمجھا، لیکن میں آپ کی عقل و دانش کا امتحان لینا نہیں چاہتا۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے، وہ نہایت سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اس طور پر کہ بچے کو بھی غلط فہمی نہ ہو سکے۔ فرض کر لیجئے کہ آپ اور میں ذرا کم سمجھ والے واقع ہوئے ہیں۔ میرے پاس تکیہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ تکیہ میں آپ کے سر پر دے ماروں۔ آپ کے پاس ایک انڈہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ اسے میرے سر پر پھوڑ دیں۔ گویا تکیہ اور انڈہ ہمارے اسلحہ ہیں۔ امن قائم رکھنے کی خاطر ہم آپس میں سمجھوتا کرنے کے لئے تحدیدِ اسلحہ کی ایک مجلس منعقد کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے لئے ایک تکیہ رکھنے کے حقوق حاصل کریں گے اور میں ایک انڈہ رکھنے کا حق طلب کروں گا۔ گویا ہم دونوں کے پاس

ایک دوسرے کو برابر کا ضرر پہنچانے کا سامان ہوگا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو حق نہیں ہوگا کہ دوسرے کے مشورے کے بغیر اپنے ہتھیاروں میں اضافہ کرکے باہمی امن کو خطرے میں ڈالے۔ اب کچھ دیر کے بعد میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ آپ کے پاس ایک قلم تراش ہے جو وقت پر مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر آپ میری توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتے ہیں کہ میرے ملکیت میں ایک کلہاڑی ہے جس سے میں ایک ہی ضرب میں گردن اڑا سکتا ہوں۔ اس پر ہمارے دلوں میں دفعتہً جذبہ امن پسندی کروٹ لیتا ہے اور میں جھٹ سے ایک قلم تراش خرید لیتا ہوں اور آپ اولین فرصت میں کلہاڑی لے آتے ہیں۔ اب حالات بین الاقوامی سیاسیات کی طرح ترقی پذیر ہو جاتے ہیں اور ایک روز میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ چونکہ میرے ہتھیاروں کے جواب میں آپ کے پاس بھی اس قسم کے ہتھیار موجود ہیں اس لئے مجھے بازار سے پستول خریدنے میں کوئی دیر نہ کرنی چاہئے۔ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔ جب میں پستول خرید لاتا ہوں تو آپ پستول کے ساتھ ساتھ ایک چمکیلی تلوار بھی لے آتے ہیں۔ اب فطری طور پر میں بھی تلوار خرید لیتا ہوں اور ساتھ ساتھ تحدید اسلحہ کے جذبے کے ماتحت ایک مشین گن بھی گاڑی پر لدوا کر لے آتا ہوں۔ تو سمجھ لیجئے کہ اب امن و امان قائم ہونے میں کوئی دیر نہیں، آپ دوڑ کر بہترین اسلحہ ساز کے یہاں سے ایک عمدہ قسم کا تباہ کن ٹینک لے آتے ہیں اور لگے ہاتھوں ایک بڑا سا ایٹم بم بھی خرید لیتے ہیں، جس سے میرے گھر کی چھت بھک سے اڑائی جا سکتی ہے۔ خاکسار بھی آپ کی دیکھا دیکھی دو ایک گولے گھر میں ڈال لیتا ہے اور بطور حفظ ماتقدم گیس بنانے والوں کو چند سلنڈر زہریلی گیس تیار کرنے کی فرمائش

بھی کر ڈالتا ہے ۔ اس گیس سے آپ کے بال بچوں کا رنگ پیلا پڑ سکتا ہے، اور آپ کے چہرے پر سوکھے ہوئے بینگن کی طرح جھریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس پر آپ اس قسم کی گیس تلاش کر لیتے ہیں جو میرے سر، میری ٹانگوں اور میرے بازوؤں کو سرے سے غائب ہی کر دے ۔ پھر آپ احتیاطاً ایک بم بار طیارہ بھی اپنے گھر میں لے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کچھ اس طرح "غیر مسلح" ہو جاتے ہیں کہ ہمارے درمیان جنگ کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہم ایک دوسرے کو بالکل فنا کر دیتے ہیں ۔ مگر یہ تباہی اتفاقی ہو گی ۔ اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہئے :۔

ہندی اور اُردو

"ہندی اور اُردو کا جھگڑا ایک زمانے سے جاری ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب ڈاکٹر تارا چند جی اور مہاتما گاندھی اس جھگڑے کو سمجھتے ہیں لیکن میری سمجھ سے یہ ابھی تک بالاتر ہے۔ کوشش کے باوجود اس کا مطلب میرے ذہن میں نہیں آیا۔ ہندی کے حق میں ہندو کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ مسلمان، اُردو کے تحفظ کے لئے کیوں بے قرار ہیں؟ — زبان بنائی نہیں جاتی، خود بنتی ہے اور نہ انسانی کوششیں کسی زبان کو فنا کر سکتی ہیں۔ مَیں نے اس تازہ اور گرما گرم موضوع پر کچھ لکھنا چاہا تو ذیل کا مکالمہ تیار ہو گیا۔"

منشی نرائن پرشاد:۔ اقبال صاحب یہ سوڈا آپ پئیں گے؟

مرزا محمد اقبال:۔ جی ہاں، میں پیوں گا۔

منشی:۔ آپ لیمن کیوں نہیں پیتے۔

اقبال:۔ یونہی، مجھے سوڈا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں سب سوڈا ہی

پیتے ہیں۔

منشی:۔ تو گویا آپ کو لیمن سے نفرت ہے۔

اقبال:۔ نہیں تو — نفرت کیوں ہونے لگی منشی نرائن پرشاد — گھر میں چونکہ سب یہی پیتے ہیں۔ اس لئے عادت سی پڑگئی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ لیمن، سوڈے کے مقابلے میں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔

منشی:۔ اسی لئے تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میٹھی چیز چھوڑ کر آپ کھاری چیز کیوں پسند کرتے ہیں۔ لیمن میں نہ صرف یہ کہ مٹھاس گھلی ہوتی ہے بلکہ خوشبو بھی ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

اقبال:۔ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں — پر —

منشی:۔ پر کیا۔

اقبال:۔ کچھ نہیں — میں یہ کہنے والا تھا کہ میں سوڈا ہی پیوں گا۔

منشی:۔ پھر وہی جہالت — کوئی سمجھے میں آپ کو زہر پینے پر مجبور کر رہا ہوں۔ — ارے بھائی لیمن اور سوڈے میں فرق ہی کیا ہے — ایک ہی کارخانے میں یہ دونوں بوتلیں تیار ہوئیں۔ ایک ہی مشین نے ان کے اندر پانی بند کیا — لیمن میں سے مٹھاس اور خوشبو نکال دیجئے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔۔

اقبال:۔ سوڈا — کھاری پانی —

منشی:۔ تو پھر اس کے پینے میں حرج ہی کیا ہے۔

اقبال:۔ کوئی حرج نہیں۔

منشی:۔ تو پیو۔

اقبال :- تم کیا پیئو گے ؟

منشی :- میں دوسری بوتل منگوا لوں گا۔

اقبال :- دوسری بوتل کیوں منگواؤ گے ——— سوڈا پینے میں کیا حرج ہے ؟

منشی :- کو ——— کوئی حرج نہیں۔

اقبال :- تو لو پیو یہ سوڈا۔

منشی :- تم کیا پیو گے ؟

اقبال :- میں ——— میں دوسری بوتل منگوا لوں گا۔

منشی :- دوسری بوتل کیوں منگواؤ گے ——— لیمن پینے میں کیا حرج ہے ؟

اقبال :- کو ——— ئی ——— حر ——— ج ——— نہیں ——— اور سوڈا پینے میں کیا حرج ہے ؟

منشی :- کو ——— ئی ——— حر ——— ج ——— نہیں۔

اقبال :- بات یہ ہے کہ سوڈا ذرا اچھا رہتا ہے۔

منشی :- لیکن میرا خیال ہے کہ لیمن ——— ذرا اچھا رہتا ہے۔

اقبال :- ایسا ہی ہو گا ——— پر میں تو اپنے بڑوں سے سنتا آیا ہوں کہ سوڈا اچھا ہوتا ہے۔

منشی :- اب اس کا کیا ہو گا ——— میں بھی اپنے بڑوں سے یہی سنتا آیا ہوں کہ لیمن اچھا ہوتا ہے۔

اقبال :- آپ کی اپنی رائے کیا ہے ؟

منشی :- آپ کی اپنی رائے کیا ہے ؟

اقبال :۔ میری رائے ـــــ میری رائے ـــــ میری رائے تو یہی ہے کہ۔
لیکن آپ اپنی رائے کیوں نہیں بتاتے۔

منشی :۔ میری رائے ـــــ میری رائے ـــــ میری رائے تو یہی ہے کہ ـــــ
لیکن میں اپنی رائے کا اظہار پہلے کیوں کروں۔

اقبال :۔ یوں رائے کا اظہار نہ ہو سکے گا ـــــ اب ایسا کیجئے کہ اپنے گلاس پر کوئی ڈھکنا رکھ دیجئے، میں بھی اپنا گلاس ڈھک دیتا ہوں۔ یہ کام کر لیں تو پھر آرام سے بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔

منشی :۔ ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ بوتلیں کھل چکی ہیں۔ اب ہمیں پینا ہی پڑیں گی۔ چلئے جلدی فیصلہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی ساری گیس نکل جائے ـــــ ان کی ساری جان تو گیس ہی میں ہوتی ہے۔

اقبال :۔ میں مانتا ہوں ـــــ اور اتنا آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیمن اور سوڈے میں کچھ فرق نہیں۔

منشی :۔ یہ میں نے کب کہا تھا کہ لیمن اور سوڈے میں کچھ فرق ہی نہیں ـــــ بہت فرق ہے ـــــ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک میں مٹھاس ہے خوشبو ہے، کھٹاس ہے۔ یعنی تین چیزیں سوڈے سے زیادہ ہیں۔ سوڈے میں تو صرف گیس ہی گیس ہے اور وہ بھی اتنی تیز کہ ناک میں گھس جاتی ہے اس کے مقابلے میں لیمن کتنا مزیدار ہے۔ ایک بوتل پیو، طبیعت گھنٹوں بشاش رہتی ہے۔ سوڈا تو عام طور پر بیمار پیتے ہیں ـــــ اور آپ نے ابھی ابھی تسلیم بھی کیا ہے کہ لیمن سوڈے کے مقابلے میں زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔

اقبال :۔ ٹھیک ہے۔ پر میں نے یہ تو نہیں کہا کہ سوڈے کے مقابلے میں لیمن اچھا ہوتا ہے۔ مزیدار کے معنی یہ نہیں کہ وہ مفید ہو گیا۔ اچار بڑا مزیدار ہوتا ہے مگر اس کے نقصان آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ کسی چیز میں کھٹاس یا خوشبو کا ہونا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ آپ کسی ڈاکٹر سے دریافت فرمائیے تو آپ کو معلوم ہو کہ لیمن معدے کے لئے کتنا نقصان دہ ہے۔ سوڈا البتہ چیز ہوئی نا ـــــ یعنی اس سے ہاضمے میں مدد ملتی ہے۔

منشی :۔ دیکھئے اس کا فیصلہ یوں ہو سکتا ہے کہ لیمن اور سوڈا دونوں مکس کر لئے جائیں۔

اقبال :۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

منشی :۔ تو اس خالی گلاس میں آدھا سوڈا ڈال دیجئے۔

اقبال :۔ آپ ہی اپنا آدھا لیمن ڈال دیں ـــ میں بعد میں سوڈا ڈال دوں گا۔

منشی :۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ پہلے آپ سوڈا کیوں نہیں ڈالتے۔

اقبال :۔ میں سوڈا لیمن مکسڈ پینا چاہتا ہوں۔

منشی :۔ اور میں لیمن سوڈا مکسڈ پینا چاہتا ہوں۔

اگر

اگر یہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا ——— ظاہر ہے کہ ان خطوط پر ہم جتنا سوچیں گے، الجھاؤ پیدا ہوتے جائیں گے۔ اور جیسا یورپ کے ایک بڑے مفکر نے کہا ہے "یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا" کے متعلق سوچ بچار کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ یہ بات ایک عام آدمی کے نقطۂ نظر سے کہی گئی ہے اور بالکل سچ ہے کیونکہ عام آدمی کا کام اگر کے چکر میں پھنسنا نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں پھنس کر وہ اپنی حرکت اپنی توجہ کی شدت اور اپنے عمل کی قوت کو بالکل کھو دے گا ——— "وہ جو کچھ کہ ہو سکتا یا ہو جاتا" پر سوچ بچار کرنا "دماغی سٹہ بازی" ہے۔ کیونکہ ان میں بھی آدمی اسپیکولیشن کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے۔ عام آدمی کا ایسی باتیں سوچنا بالکل بیکار ہے۔ لیکن فلسفی کی بات الگ ہے۔ وہ جب نامعلوم ممکنات کا کھوج لگاتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ حال اور مستقبل دونوں سے متعلق ہے۔ عارضی اور دائمی دونوں چیزوں سے اسے واسطہ ہے۔ انسان کی متبدل اور غیر متبدل دونوں قسم

کی عادات اس کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ اس کے دماغ میں ایسے سوالوں کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ اگر فلاں فلاں حادثہ وقوع پذیر نہ ہوتا تو زمانے کی رفتار کیسی ہوتی۔ فلاں ارادے یا فیصلے میں اگر تھوڑی سی ترمیم ہوتی تو واقعات کا رخ کیسا ہوتا۔ اگر فلاں آدمی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے یا کچھ دیر بعد مرتا تو زندگی میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی۔

"اگر" کی بے شمار ایسی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس کو ہر رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "اگر" کے میدان میں ایسے کئی گھوڑے دوڑائے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر حکیم سقراط اس مار دھاڑ میں جو کہ چار سو چوبیس سال قبل از مسیح ایتھنز کے باشندوں نے مچائی تھی، قتل ہو گیا ہوتا تو افلاطون اور ارسطو کا نام کبھی سننے میں نہ آتا۔ یونانی فلسفے کا وجود تک نہ ہوتا اور وہ سبق جو یورپ کی دانش گاہوں میں دو ہزار سال سے پڑھایا جا رہا ہے، معرضِ وجود ہی میں نہ آتا ——— اس "اگر" پر اگر غور کیا جائے تو کتنی دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ بیتے ہوئے زمانے کا دو ہزار سال لمبا تھان کھول کر اس کے تمام نقش و نگار مٹا کر نئے بیل بوٹے بنانا کم دلچسپ نہیں ——— اور اگر یہ سوچا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو کیا ہوتا ——— یہ "اگر" بہت مشہور ہے اور اس پر غور بھی کیا جا چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ عورتوں کی ناک کے سائز کو اتنا اہم نہ سمجھیں اور کسی خاتون کی ناک کو قوموں کی قسمت تبدیل کرنے والی نہ

مانیں مگر اس بات پر پھر بھی بحث ہو سکتی ہے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرہ بھر بڑی یا چھوٹی ہوتی تو اس کی خوب صورتی میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اگر اس کی خوب صورتی میں فرق آ جاتا تو وہ نہ جولیس سیزر کو اور نہ مارک انطونی کو مسحور کر سکتی چنانچہ رومن ہسٹری بالکل مختلف طریقے پر لکھی جاتی۔ چنانچہ عیسائیوں کی تاریخ تمدن بھی بالکل مختلف ہوتی اور —— خدا جانے اور کیا کیا کچھ نہ ہوتا اور کیا کیا کچھ ہوتا۔

آیئے ہم چند تاریخی "اگروں" پر سرسری نظر ڈالیں۔

اگر سابق قیصر جرمنی ولیم دوئم اور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم ایک دوسرے سے دلی نفرت نہ رکھتے ہوتے تو سن چودہ کی بڑی لڑائی معرض وجود ہی میں نہ آتی۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ ایڈورڈ کو قیصر ولیم کی خود بینی پسند نہ تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں ان کے دل نفرت کے جذبات سے معمور ہو گئے جو سالہا سال تک قائم رہے اس دوران میں چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات بھی ان کو مشتعل کرتے رہے۔ چنانچہ کاؤنٹس آف واروک نے اس قسم کے ایک معمولی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ ایڈورڈ اور قیصر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ ان کے سامنے سے جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر گزرا۔

قیصر نے پوچھا: "یہ مختصر سا عجیب و غریب آدمی کون ہے؟"

ایڈورڈ نے جواب دیا: "مشہور و معروف جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر۔"

قیصر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: "اوہ —— ملٹن پرائر۔ وہ جرنلسٹ۔"

شہنشاہ ایڈورڈ قیصر کی اس بد تمیزی سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور اس کو ذلیل کرنے کی ٹھان لی۔ "آپ اس سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے" شہنشاہ ایڈورڈ

نے اس انداز میں کہا گویا انھوں نے قیصر کی حقارت آمیز گفتگو کا مقصد ہی نہیں سمجھا۔

اس سے پہلے کہ شہنشاہ ایڈورڈ کا تند مزاج بھانجہ کچھ کہہ سکے۔ انھوں نے ملٹن پرائر کو قریب آنے کا اشارہ کر دیا۔ جب وہ پاس آگیا تو شہنشاہ نے یوں تعارف کرایا "مسٹر پرائر۔ قیصر نے خواہش ظاہر کی کہ میں تمہاری اس سے ملاقات کراؤں۔"

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخصی منافرت جنگ کے دیوتا کو مشتعل کرنے کا سبب بنی اور انگریزوں سے جرمنی کے حسد اور نفرت کی آگ کا ایندھن بن گئی اور سن چودہ میں جنگ عظیم شروع ہو گئی۔

اگر نیپلز میں لیڈی ہملٹن نے نلسن سے ملاقات نہ کی ہوتی اور وہ اس پر عاشق نہ ہو جاتا کہ بہت ممکن ہے نیل کی جنگ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتی۔

اٹلی کا ارادہ نلسن کی مدد کرنے کا نہ تھا۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جا رہے تھے۔ لیکن حسین اور جادو نظر ایما یعنی لیڈی ہملٹن نے اپنے مدبر شوہر کے پردے میں زنجیر کو حرکت دی اور اس کے جہازوں کو سامان رسد فراہم کرنے اور مہم پر روانہ ہونے میں مدد دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس خاتون نے اپنے عاشق نلسن کو بہت سی راز کی باتیں بھی معلوم کر کے بتلائیں۔

اگر ملکہ الزبتھ اسپین کے شہنشاہ فلپ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی اور ملکہ میری کے پروانہ موت پر دستخط نہ کرتی تو انگلستان پر آرمیڈا یعنی اسپین کا زبردست جنگی بیڑہ کبھی حملہ نہ کرتا۔

سیاست کی بساط پر ملکہ انگلستان نے شاہ فرانس اور شاہِ اسپین کو ایک دوسرے کے مقابلے میں احمق بنا کر یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ملکہ میری جب قتل ہوئی تو فلپ کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ میری نے اپنی وصیت میں فلپ کو تاج و تخت کا مالک قرار دیا تھا جو اس کا سب سے زیادہ قریبی عزیز اور کیتھولک تھا۔ فلپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر انگلستان فتح ہوگیا تو یورپ میں کیتھولک مذہب کا پھر پچھلا سا اقتدار ہو جائے گا۔ بس اس نے بغیر سوچے سمجھے آرمیڈا کو انگلستان فتح کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا اور اسپین کی ساری شان و شوکت خاک میں مل گئی۔

اگر شہنشاہ میکس میلیاں ایک مغرور اور ضدی عورت سے شادی نہ کرتا تو میکسیکو خونیں انقلاب سے محفوظ رہتا اور ساتھ ہی شہنشاہ کی جان بچ جاتی۔

میکسیکو کے باشندے اس بات کے خلاف تھے کہ ان کے وطن پر کوئی غیر ملکی حکمران ہو۔ ان کی مرضی کے خلاف نپولین سوئم ان پر میکس میلیاں کی حکومت عائد کر رہا تھا جس سے انہوں نے یکسر انکار کر دیا۔ میکس میلیاں نے جب دیکھا کہ معاملات دگرگوں ہو چکے ہیں تو اس نے چاہا کہ تخت سے دستبردار ہو جائے مگر اس کی ضدی اور مغرور ملکہ بیچ میں حائل ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند کو غیرت دلائی "ایسی باتیں صرف بڈھوں اور احمقوں کو زیب دیتی ہیں ـــــــ چونتیس سال کے جوان شہنشاہ کے لئے یہ انتہائی ذلت اور بزدلی ہوگی اگر وہ تخت سے دستبردار ہو جائے۔"

اس کے بعد وہ بعجلت تمام شہنشاہِ فرانس کے پاس آئی اور نپولین سوئم سے

فوجی امداد کی ملتجی ہوئی۔ لیکن امریکہ نے نپولین کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا چنانچہ اس نے فوجی امداد سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر ملکہ امداد و اعانت کی فکر میں سرگرداں تھی۔ ادھر میکس میلیاں اور اس کی فوج صدر واریز کے ہاتھوں شکست پر شکست کھا رہی تھی۔ ملکہ کی ضد آخر رنگ لائی اور اس کے نیک دل شوہر میکس میلیاں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ــــ کہتے ہیں کہ ملکہ کو پھر کبھی اپنے شوہر کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور مدت تک اس پر غم کے باعث دیوانگی کی کیفیت طاری رہی۔

اگر ــــ یہ بڑا دلچسپ اگر ہے ــــ اگر کولمبس نے امریکہ دریافت نہ کیا ہوتا تو ظاہر ہے کسی اور نے دریافت کر لیا ہوتا کیونکہ پرانی دنیا سے یہ نئی دنیا زیادہ دور نہیں۔ مگر ہمیں تو صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر کولمبس نے یہ دنیا دریافت نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا ــــ فورڈ کی موٹر کاریں نہ ہوتیں۔ لیگ آف نیشنز نہ ہوتی۔ انگریزوں کا تمباکو سے تعارف نہ ہوتا اور نہ آئرستان میں آلوؤں کی کاشت ہوتی ــــ چارلی چپلن جیسا مسخرہ نہ ہوتا اور یہ فلم نہ ہوتے۔

فلموں اور آلوؤں کو چھوڑیئے ــــ آپ یہ سوچیئے کہ اگر راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نہ نکلتا تو کیا ہوتا ــــ ظاہر ہے کہ ہر سال دسہرے کے موقعے پر راون جلایا جاتا ہے نہ جلایا جاتا۔

تاریخی بیان ہے کہ جب راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نکل گیا تو رانی کیکئی نے میخ کی جگہ اپنی انگلی داخل کر دی اور یوں رتھ کو بچا لیا۔ راجہ دسرتھ اپنی رانی کے اس ایثار سے بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے خوش ہو کر کہا "مانگ مجھ سے کیا

مانگتی ہے۔ رانی کیکئی نے اس وقت تو کچھ نہ مانگا مگر جب رام چندر جی کو گدی پر بٹھایا جانے لگا تو اس نے اپنے خاوند کو اس کا وچن یاد دلایا اور کہا: "میری یہ خواہش ہے کہ آپ رام کو چودہ سال کے لئے جنگلوں میں بھیج دیں اور میرے لڑکے بھرت کو گدی پر بٹھا دیں۔" چنانچہ رام چندر جی کا بن باس ہوا اور ان کی راون سے معرکہ خیز جنگ ہوئی۔

اس طرح اگر دروپدی طعن آمیز لہجے میں دریودھن سے یہ نہ کہتی کہ آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو۔ تمہیں سجھائی کیسے دے گا تو بہت ممکن ہے مہابھارت نہ لڑی جاتی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پانڈوں کے حصے میں بہت خراب زمین آئی تھی جس کو انہوں نے بڑی محنت سے صاف کیا اور کاریگری کے ایسے نمونے پیدا کئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسا فرش بنایا تھا کہ تالاب معلوم ہو اور ایسا تالاب بنایا تھا جو فرش معلوم ہو۔ پانڈوں نے جب کوروں کو اپنے یہاں دعوت دی تو وہ صنعت کے یہ نادر نمونے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ دریودھن تو بوکھلا سا گیا۔ ایک فرش کو اس نے یہ سمجھا کہ تالاب ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا لباس اوپر اڑس لیا۔ کہتے ہیں اس موقعہ پر دروپدی نے یہ طعنہ زنی کی "آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو، تمہیں سجھائی کیسے دے گا ——— چنانچہ یہ طعنہ آگے چل کر مہابھارت کا موجب ہوا۔

اگر چنگیز خاں پیدا نہ ہوتا تو مغرب کی بیداری میں ایک زمانہ صرف ہوتا، چینیوں کو مقناطیسی سوئی کا استعمال ایک مدت سے آتا تھا مگر نئے یورپ سے اس ایجاد کا تعارف چنگیز خاں کے حملوں کی بدولت ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر قطب نما

جیسی اہم ایجاد کا علم صرف چین تک ہی محدود رہتا تو کولمبس اور واسکوڈے گاما اتنے لمبے سمندری سفر کبھی نہ کرتے۔ اگر چنگیز خاں پیدا نہ ہوتا تو آج روس کی شکل ہی اور ہوتی کیونکہ وہ منگولوں کی غلامی سے بچا رہتا۔

دشمن کے بحری بیڑے کا کھوج لگانے کے سلسلے میں جنرل نلسن مالٹا سے مصر تک گیا۔ یہ ۱۷۹۸ء کا ذکر ہے۔ ۲۲ جون اور ۲۸ جون کے درمیانی عرصے میں انگریزوں کا جنگی بیڑہ فرانسیسیوں کے جنگی بیڑے کے پاس سے ہو کر گزرا مگر ان میں سے کسی کو ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہ ہوا ——— بحیرۂ روم کی ایک کالی رات ہیں دنیا کی سب سے بڑی اگر دیر تک کانپتی رہی۔ اگر طرفین کے کسی جہاز میں روشنی کی ہلکی سی شعاع نظر آجاتی، کوئی آواز سنائی دے جاتی۔ کوئی فوجی موج میں آکر گیت گا دیتا اور نلسن کو دشمن کے بحری بیڑے کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو دنیا نپولین کے نام سے بالکل ناآشنا ہوتی۔ اس کا نام جنگی تذکروں میں ایک ایسے جرنیل کی حیثیت سے لکھا جاتا جو کافی اہلیتوں کا مالک ہو اور بس ——— روس پر نپولین کا ناکام حملہ نہ ہوتا اور یوں فرانس کے ایک لاکھ پچیس ہزار آدمی مارے نہ جاتے، ایک لاکھ تیئس ہزار آدمی سردی اور تھکاوٹ کی بھینٹ نہ چڑھتے اور ایک لاکھ ترانوے ہزار فرانسیسی روسیوں کے قیدی نہ بنتے۔

اگر اسٹیفن چائے کی کیتلی کی ٹونٹی پر چمچہ نہ رکھتا تو اسے بھاپ کی طاقت معلوم نہ ہوتی اور ریلوے انجن کبھی نہ بنتا ——— اگر درخت سے سیب نہ گرتا تو نیوٹن کشش ثقل کیسے دریافت کر سکتا ——— اگر مہاتما گاندھی نہ ہوتے تو آج اس ونوبھا بھوے کو کون جانتا ——— اگر مارکونی نہ ہوتا تو ریڈیو نہ ہوتے ———

اگر ہٹلر نہ ہوتا تو یہ دوسری جنگِ عظیم معرضِ وجود میں نہ آتی۔ اگر حضرت آدم بہشت سے نکالے نہ جاتے تو اس دنیا کے بجائے کوئی اور ہی دنیا ہوتی۔ اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا اور اگر خدا نہ ہوتا تو ......

ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ

ہم ایک عرصے سے یہ شور سن رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس چیز سے بچاؤ، اس چیز سے بچاؤ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو ان لوگوں سے بچانا چاہئے جو اس قسم کا شور پیدا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شور پیدا کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر ان کے دل اخلاص سے بالکل خالی ہیں۔ رات کو کسی جلسے میں گرماگرم تقریر کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے پُر تکلف بستروں میں سوتے ہیں تو ان کے دماغ بالکل خالی ہوتے ہیں۔ ان کی راتوں کا خفیف ترین حصّہ بھی اس خیال میں نہیں گزرتا کہ ہندوستان کس مرض میں مبتلا ہے۔ دراصل وہ اپنے مرض کے علاج معالجے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انہیں اپنے وطن کے مرض کے بارے میں غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔

یہ لوگ جو اپنے گھروں کا نظام درست نہیں کر سکتے، یہ لوگ جن کا کیریکٹر بے حد پست ہوتا ہے، سیاست کے میدان میں اپنے وطن کا نظام ٹھیک کرنے اور لوگوں کو اخلاقیات کا سبق دینے کے لئے نکلتے ہیں ـــــ کس قدر مضحکہ خیز چیز ہے!

یہ لوگ جنہیں عرف عام میں لیڈر کہا جاتا ہے، سیاست اور مذہب کو وہ لنگڑا، لولا اور زخمی آدمی تصور کرتے ہیں، جس کی نمائش سے ہمارے یہاں گداگر عام طور پر بھیک مانگتے ہیں۔ سیاست اور مذہب کی لاش ہمارے یہ نام نہاد لیڈر اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں اور سیدھے سادے لوگوں کو جو ہر وہ بات مان لینے کے عادی ہوتے ہیں جو اونچے سروں میں کہی جاتی ہے۔ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس لاش کو از سر نو زندگی بخش رہے ہیں۔

مذہب جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ایک جیسا رہے گا۔ مذہب کی روح ایک ٹھوس حقیقت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ مذہب ایک ایسی چٹان ہے جس پر سمندر کی خشمناک لہریں بھی اثر نہیں کر سکتیں۔ یہ لیڈر جب آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مذہب ایسی چیز ہی نہیں کہ خطرے میں پڑ سکے۔ اگر کسی بات کا خطرہ ہے تو وہ ان لیڈروں کا ہے جو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے مذہب کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے یہ نام نہاد لیڈر اپنی بغل میں ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں، جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک لمبی دوڑ ہے، سرمائے کے پیچھے۔ ان کے ہر سانس میں، آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کر سکتے ہیں۔

لمبے لمبے جلوس نکال کر، منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر، چوراہوں پہ لمبی طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر، ہماری قوم کے یہ نام نہاد راہ نما

صرف اپنے لئے راستہ بناتے ہیں جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے۔

یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں مگر کیا انہوں نے آج تک بے کاری کا حل پیش کیا ہے؟ —— یہ لوگ مذہب مذہب چلاتے ہیں مگر کیا انہوں نے خود کبھی مذہب کے احکام کی پیروی کی ہے؟ —— یہ لوگ جو خیرات میں دیئے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں، چندوں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ جو مستعار اشیا پر جیتے ہیں، جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں۔ ملک و ملت کی راہبری کیسے کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں جو نئے سے نیا راگ الاپتے رہیں۔ ہمارے ملک کو صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاص رکھتا ہو، جس کے سینے میں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو۔ جو برہنہ پا اور گرسنہ شکم آگے بڑھے اور وطن کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں باگیں ڈال کر اسے آزادی کے میدان کی طرف مردانہ وار لئے جائے۔

یاد رکھئے وطن کی خدمت شکم سیر لوگ کبھی نہیں کر سکیں گے۔ روزنی معدے کے ساتھ جو شخص وطن کی خدمت کے لئے آگے بڑھے، اُسے لات مار کر باہر نکال دیجئے۔ حریر و پرنیاں میں لپٹے ہوئے آدمی ان کی قیادت نہیں کر سکتے۔ جو سخت زمین پر سونے کے عادی ہیں اور جن کے بدن نرم و نازک پوشاک سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ریشمی کپڑے پہن کر آپ کو غربت کا سدِباب بتانے کی جرأت کرے تو اس کو اٹھا کر وہیں پھینک دیجئے جہاں سے نکل کر وہ آپ لوگوں میں آیا تھا۔

یہ لیڈر کھٹمل ہیں جو وطن کی کھاٹ میں چولوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان

کو نفرت کے ابلتے ہوئے پانی کے ذریعے باہر نکال دینا چاہئے۔ یہ لیڈر جلسوں میں سر ملٹے اور سرمایہ داروں کے خلاف زہر لگتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ خود سرمایہ اکٹھا کر سکیں۔ کیا یہ سرمایہ داروں سے بدتر نہیں؟ —— یہ چوروں کے چور ہیں، رہزنوں کے رہزن —— اب وقت آگیا ہے کہ عوام ان پر اپنی بے اعتمادی ظاہر کر دیں۔

ضرورت ہے کہ پھٹی ہوئی قمیصوں والے نوجوان اٹھیں اور عزم کو خشم کو اپنی چوڑی چھاتیوں میں لے ان نام نہاد لیڈروں کو اس بلند مقام پر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیں۔ جہاں یہ ہماری اجازت لئے بغیر چڑھ بیٹھے ہیں۔ ان کو ہمارے ساتھ، ہم غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی حق حاصل نہیں، —— یاد رکھئے غربت لعنت نہیں ہے جو اسے لعنت ظاہر کرتے ہیں وہ خود ملعون ہیں۔ وہ غریب اس امیر سے لاکھ درجے بہتر ہے جو اپنی کشتی خود اپنے ہاتھوں سے کھیتا ہے —— اپنی کشتی کے کھویا خود آپ بنئے —— اپنا نفع نقصان خود آپ سوچئے۔ اور پھر ان لیڈروں ان نام نہاد راہنماؤں کا تماشا دیکھئے کہ وہ زندگی کے وسیع سمندر میں اپنی زندگی کا وزنی جہاز کس طرح چلاتے ہیں:

ایک اشک آلود اپیل

(امرت سر کی تنگ گلیوں اور اس کے غلیظ بازاروں سے بھاگ کر جب میں بمبئی پہنچا تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت اور وسیع شہر کی فضا فرقہ وارانہ جھگڑوں سے پاک ہوگی مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ چند مہینوں کے بعد ہی بمبئی میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا اور دیر تک جاری رہا۔ فساد کا موضوع وہی تھا مندر مسجد، کئی انسان اس فساد میں ہلاک ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ افسوسناک مناظر دیکھے اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور ذیل کی اپیل اہالیانِ بمبئی کے نام شائع کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو غیرت مند" مسلمان مجھے مارنے کے لئے آئے۔ میں ان کی مار سے کیسے بچا، یہ ایک علیحدہ کہانی ہے)

آخر وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا "سبھا منڈپ" کے قضیئے نے افسوس ناک صورت اختیار کی اور بمبئی کی پُرسکون فضا میں ہنگامہ پیکار نے اضطراب پیدا کردیا۔ ہماری آنکھوں نے ایسے ایسے مظالم اور انسانیت کش مناظر دیکھے۔ جس پر

ہر حساس، تلب خون کے آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاقو چلے، پتھر پھینکے، لٹھ بازی ہوئی۔ ڈاکے ڈالے گئے اور آناً فاناً بمبئی کے گلی کوچوں میں خون کے چھینٹے اُڑنے لگے۔

ہندوستان حصولِ آزادی کی منزل سے گھسیٹ کر ایک وسیع اور تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا۔

ان افسوسناک فسادات پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ وہ حضرات جو آزادی کی قدر کرتے ہیں اور جن کے قلوب اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس قسم کے جھگڑے اور فساد ملک اور قوم کے لئے بے حد مہلک ہیں، یقیناً رو رہے ہوں گے۔ ان کی افسردگی اور رنجیدگی حق پر مبنی ہے۔

کوئی ذی عقل اور صاحبِ ہوش و فہم انسان خون بہانا پسند نہیں کرتا سوائے ان کے جو اپنے اذہان کی آغوش میں بھیانک جرائم و شدائد کی پرورش کرتے ہیں۔ کوئی انسان اپنے بھائی کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی رگوں سے بہتے ہوئے خون کا تماشا کرنے سے مسرور نہیں ہو سکتا۔ کسی شخص کی بھی یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ وہ لاشوں کے انبار پر فرطِ مسرت سے رقص کرے ...... پھر کیا وجہ ہے کہ چشمِ فلک نے بمبئی کے سینے پر خون کے دھبوں کو ابھرتے دیکھا؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں ان فسادات کے عواقب و عواطف کو بغور دیکھنا چاہئے اور معلوم کرنے کی سعی کرنا چاہئے کہ ان خونیں حادثات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

دنیا میں جہاں اہلِ درد اور انسانیت دوست انسان ہیں، وہاں ایسے افراد

بھی ہیں جن کا بیشتر وقت تلواروں اور چھریوں کی دھاریں تیز کرنے میں گزرتا ہے اور جو ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے تیز کئے ہوئے ہتھیار لوگوں کے ہاتھ میں دے کر خونریزی کا سماں دیکھیں اور پھر خون کے اس تالاب سے اپنی حرص اور اپنے مفاد کی پیاس بجھائیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو جنگلی لوگوں کی بربریت کو از سرِ نو ہندوستان کی فضا میں تازہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فضا کو غیر محفوظ کر کے اپنے انفرادی مفاد کو محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ بازاروں میں دیگر اجناس کی طرح انسانی گوشت پوست کی دکانیں بھی ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے ہر عضو کو مفلوج دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ جو اپنی مادرِ وطن کو آزاد دیکھنے کے خواہشمند نہیں ـــــ جو مکار ہیں، غدار ہیں، جن کی رگ رگ اور نخ نخ میں بدی کا خون موجزن ہے، جن کی زندگی کا ہر سانس ان کی ریاکاری، دغابازی، ابلہ فریبی اور انسان دشمنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جن کے تنفس میں جہنم کی آگ کے جھونکے ہیں، بدی کے تعفن کے بھبکے ہیں۔ تین دمڑی کا پیسہ جن کا خدا ہے اور جو اس معبود کی عبادت میں شب و روز محو رہتے ہیں۔

یہ لوگ لیڈر ہیں ـــــ ملک و قوم کے نام نہاد رہنما ـــــ بلی کے پنجے اوپر سے دیکھو تو نرم نرم روئیں اور اندر تیز تیز ناخن۔ تقریریں سنئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کا درد سمٹ کر ان کے سینوں میں جمع ہو گیا ہے اور جب ان کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ان کا ایمان و ایقان ان کا جذبہ خدمتِ مذہب و ملت، ان کی طہارت، ان کے بلند بانگ وعظ اور

ان کا درد سب کچھ اصلی روپ میں نظر آتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے دامن پر اس قدر بدنما دھبے بھی موجود ہیں۔

بمبئی کی موجودہ ہنگامہ خیزیاں اور خونریزیاں یقیناً رک سکتی تھیں اور ہندو مسلمانوں کے جذبات کو یقیناً ان خراشوں سے بچایا جا سکتا تھا اگر جانبین تحمل اور بردباری سے کام لیتے اور ٹھنڈے دل سے تمام معاملے پر غور کر کے مفاہمت کی کوئی راہ نکالتے۔ برادرانہ اخوت کو کام میں لا کر ملک کو اس مہلک ضرب سے بچانے کی کوشش کرتے۔

چند حضرات نے اس قسم کی کوششیں کیں مگر مقامِ تاسف ہے، کہ ان سانپوں کی پھنکاروں (میرا اشارہ حافظ علی بہادر خاں کی طرف تھا) نے بنا بنایا معاملہ بگاڑ دیا، جو اپنے زہریلے سانسوں کے مظاہرے کے لئے اس نوع کے لمحات کو بہت مناسب اور مقصد پرور خیال کرتے ہیں۔

جن لیڈروں نے مذہب کا ڈھنڈورا پیٹ کر اور اپنا گلا پھاڑ کر شہریوں کے جذبات کو مشتعل کیا ہے اور یہاں کے گلی کوچوں کی سلوں پر ایک خونچکاں داستان کے نہ مٹنے والے حروف کندہ کئے ہیں، انہیں اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہئے کہ ملک میں ایسی صاحب فہم و دانش جماعت موجود ہے جو ان کی شرانگیزیوں کو خوب سمجھتی ہے اور جو انہیں نفرت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

قصرِ آزادی کی تعمیر فرقہ وارانہ فسادات کے شکار انسانوں کے لہو اور خود غرض لیڈروں کے نمائشی پروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ان لوگوں کا وجود نہ صرف آزادی اور اخوت کی راہ میں سنگِ گراں ہے بلکہ انسانیت کے جسم پر ایک کاری

ضرب ہے ۔ یہ لوگ اصلی ہمدردانِ وطن کی گردنوں پر مردِ تسمہ پا کی طرح سوار ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان فساد پرور لیڈروں کا مقاطعہ کیا جائے اور ہر چہار اکناف سے ان پر لعنتیں برسائی جائیں ۔ جو ہر گام پر نوجوانانِ وطن کی امیدوں اور اُن کے ولولوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں ۔

مجھے شکایت ہے

مجھے شکایت ہے ان لوگوں سے جو اُردو زبان کے خادم بن کر ماہانہ، ہفتہ وار یا روزانہ پرچہ جاری کرتے ہیں۔ اور اس "خدمت" کا اشتہار بن کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں مگر ان مضمون نگاروں کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ جن کے خیالات و افکار ان کی آمدنی کا موجب ہوتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان اڈیٹروں سے جو اڈیٹر بھی ہیں اور مالک بھی۔ جو مضمون نگاروں کی بدولت چھاپے خانے کے مالک بھی ہیں لیکن جب ایک مضمون کا معاوضہ دینا پڑ جائے تو ان کی روح قبض ہو جاتی ہے۔

مجھے شکایت ہے ان سرمایہ داروں سے جو ایک پرچہ روپیہ کمانے کے لئے جاری کرتے ہیں اور اس کے اڈیٹر کو صرف پچیس یا تیس روپلے ماہوار تنخواہ دیتے ہیں۔ ایسے سرمایہ دار خود تو بڑے آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن وہ اڈیٹر جو خون پسینہ ایک کرکے ان کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں، آرام دِہ زندگی سے ہمیشہ دور رکھے جاتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان ناشروں سے جو کوڑیوں کے دام تصانیف خریدتے ہیں اور اپنی جیبوں کے لئے سینکڑوں روپے اکٹھے کر لیتے ہیں جو سادہ لوح مصنفین کو نہایت چالاکی سے پھانستے ہیں اور ان کی تصانیف ہمیشہ کے لئے ہڑپ کر جاتے ہیں۔

مجھے شکایت ہے ان سرمایہ دار جہلاء سے جو روپے کا لالچ دے کر غریب اور افلاس زدہ ادیبوں سے ان کے افکار حاصل کرتے ہیں اور اپنے نام سے انہیں شائع کرتے ہیں۔

سب سے بڑی شکایت مجھے ان ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے ہے جو اخباروں اور رسالوں میں بغیر معاوضے کے مضمون بھیجتے ہیں۔ وہ کیوں اس چیز کو پالتے ہیں جو ایک دھیلا بھی ان کے منہ میں نہیں ڈالتی۔ وہ کیوں ایسا کام کرتے ہیں جس سے ان کو ذاتی فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ کیوں ان کاغذوں پر نقش و نگار بناتے ہیں جو ان کے لئے کفن کا کام بھی نہیں دے سکتے۔

مجھے شکایت ہے — مجھے شکایت ہے — مجھے ہر اس چیز سے شکایت ہے جو ہمارے قلم اور ہماری روزی کے درمیان حائل ہے۔ مجھے اپنے ادب سے شکایت ہے جس کی کنجی صرف چند افراد کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ ادب کی کنجی پریس ہے، جس پر چند ہوس پرست سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ چند ایسے تاجروں کا قبضہ ہے جو ادب سے اتنے ہی دور ہیں جتنے کہ وہ تجارت کے نزدیک

مجھے اپنے ہم پیشہ ادیبوں سے شکایت ہے جو ان چند افراد کی ذاتی اغراض اپنے قلم سے پوری کرتے ہیں۔ جو ان کے جائز و ناجائز مطالبے پر اپنے دماغ کی قاشیں

پیش کر دیتے ہیں۔ مجھے شکایت ہے۔ مجھے اپنے آپ سے بھی شکایت ہے، اس لئے کہ میری آنکھیں بہت دیر کے بعد کھلی ہیں۔ بڑی دیر کے بعد یہ مضمون میں لکھنے بیٹھا ہوں۔ جو آج سے بہت پہلے مجھے لکھ دینا چاہئے تھا۔

ہندی ہندوستانی اور اُردو ہندی کے قضیئے سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اپنی محنت کے دام چاہتے ہیں۔ مضمون نویسی ہمارا پیشہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے زندہ رہنے کا مطالبہ نہ کریں۔ جو پرچے جو رسالے جو اخبار ہماری تحریروں کے دام ادا نہیں کر سکتے بالکل بند ہو جانے چاہئیں۔ ملک کو ان پرچوں کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ادب ہی کو ان کی کوئی ضرورت ہے۔

ملک اور اس کے ادب کو لکھنے والے چاہئیں اور لکھنے والوں کو ایسے اخبار اور ایسے رسالے چاہئیں جو ان کی محنت کا معاوضہ ادا کریں۔ اخبار اور رسالے چھاپنا کوئی رضاکارانہ کام نہیں ہے۔ وہ لوگ جو زبان اور ادب کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ زبان اور ادب کی خدمت کاغذ سیاہ کر دینے سے نہیں ہوتی۔ ہر مہینے کاغذوں کا ایک پلندہ پیش کر دینے سے نہیں ہوتی۔ زبان اور ادب کی خدمت ہو سکتی ہے صرف ادیبوں اور زبان دانوں کی حوصلہ افزائی سے۔ اور حوصلہ افزائی صرف ان کی محنت کا معاوضہ ادا کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

پچھلے دنوں میں نے اپنا ایک مضمون ہندوستان کے ایک ایسے ماہنامہ پرچے کو بھیجا جس کی آمدن سے پچیس لکھنے والوں کی مالی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ مضمون کے ساتھ میں نے ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا تھا کہ اگر آپ اس کا معاوضہ ادا کر سکیں

ہوں تو اپنے پرچے میں چھاپیں ورنہ واپس بھیج دیں۔

جیسا کہ مجھے معلوم تھا مضمون واپس بھیج دیا گیا اس کے ساتھ اڈیٹر صاحب نے جو خط بھیجا اس میں یہ لکھا تھا کہ چونکہ جنگ کے باعث بہت سے اخراجات کی کمی کرنا پڑی ہے۔ اس لئے رسالے کے مالکوں نے مضامین کی اجرت دینے کا سلسلہ بھی بند کر دیا ہے۔

یہ خط پڑھ کر میرے جی میں آئی کہ اس کا جواب اس طرح لکھوں "مجھے بہت افسوس ہے کہ جنگ کے باعث آپ کی مالی حالت اِتنی کمزور ہوگئی ہے کہ آپ کو مضامین کے معاوضے کا سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ میری رائے ہے کہ آپ پرچہ بند کر دیں۔ خواہ مخواہ نقصان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنگ ختم ہو جانے پر جب حالات موافق ہو جائیں تو پھر سے اپنا پرچہ جاری فرما دیجئے گا۔"

میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایسے پرچوں کا وجود نہیں ہونا چاہیے جو معاوضہ ادا کرتے وقت اس قسم کے عذرِ لنگ پیش کریں۔ آخر ملک کو ایسے پرچوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی اشاعت بالکل بند کر دی جائے تاکہ دوسرے پرچے جو ادیبوں کو ان کی محنت کا حق ادا کرتے ہیں، زیادہ پھول پھل سکیں۔ ہمارے ادب کو دس ہزار اخباروں اور رسالوں کی ضرورت نہیں۔ صرف دس کی ضرورت ہے جو ہماری ضروریات پوری کریں۔

وہ پرچے وہ رسالے وہ اخبار جو ہماری ضروریات پوری نہیں کرتے، آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے لئے کیوں جدوجہد کریں۔ جب وہ زندگی میں ہمارے ممد و معاون نہیں ہوتے۔

مضمون نگار دماغی عیاش نہیں، افسانہ نگار خیراتی ہسپتال نہیں ہیں۔ ہم لوگوں کے دماغ لنگر خانے نہیں ہیں۔ ہم اس زمانے کو اور اس کی یاد تک کو ماضی کے تاریک گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہتے ہیں۔ جب شاعر بھک منگے ہوتے تھے اور جب صرف وہی لوگ عیاشی کے طور پر مضمون نگاری کیا کرتے تھے جن کے پاس کھانے کو کافی ہوتا تھا۔

ہم نئے زمانے، نئے نظام کے پیغامبر ہیں۔ ہم ماضی کے کھنڈروں پر مستقبل کی دیواریں استوار کرنے والے معمار ہیں۔ ہمیں کچھ کرنا ہے۔ ہمارے راستے میں مشکلات حائل نہیں ہونی چاہئیں۔ ہم گرسنہ شکم اور برہنہ پا نہیں رہ سکتے ہمیں اپنے قلم سے روزی کمانا ہے اور ہم اس ذریعے سے روزی کما کر رہیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم اور ہمارے بال بچے فاقے مریں اور جن اخباروں اور رسالوں میں ہمارے مضامین چھپتے ہیں، ان کے مالک خوشحال رہیں۔

ہم ادیب ہیں، بھڑ بھونجے نہیں۔ ہم افسانہ نگار ہیں، کنجڑے نہیں۔ ہم شاعر ہیں بھنگی نہیں۔ ہمارے ساتھ دنیا کو امتیازی سلوک روا رکھنا ہوگا۔ ہم لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ ہمارا احترام کریں۔ ہم تاروں سے باتیں کرنے والے ہیں۔ ہم ایسی باتیں ہرگز نہیں سنیں گے جو ہمیں پستی کی طرف لے جائیں۔ ہمارا رتبہ ہر لحاظ سے ان لوگوں سے بہتر ہے جو صرف روپے گننے کا کام جانتے ہیں۔ ہم ہر جہت سے ان لوگوں کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہیں۔ جو نہ بنا سکتے ہیں اور نہ ڈھا سکتے ہیں۔

ہم ادیب ہم شاعر ہم افسانہ نگار بنا بھی سکتے ہیں اور ڈھا بھی سکتے ہیں۔

ہمارے ہاتھ میں قلم ہے، جو قوموں کی سوئی ہوئی تقدیریں جگا سکتا ہے جو ایک ایک جنبش کے ساتھ انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

ہماری عظمت ہماری بزرگی تسلیم کرنا ہوگی۔ ان تمام لوگوں کو ماننا ہوگی جو ہمارے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے لئے ہندوستانیوں کو ایک خاص جگہ بنانا ہوگی۔ جہاں ہم آرام و اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ہمیں تاج و تخت کی خواہش نہیں۔ ہم کشکول لے کر پھرنے والے انسان نہیں ہیں۔ ہم زر و دولت کے انبار نہیں چاہتے۔ ہم گداگر نہیں ہیں۔ ہم انسانوں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ ہم انسان ہیں۔

ہم پر وہ دروازے کیوں بند کر دیئے جاتے ہیں، جن میں سے گزر کر ہمیں آگے بڑھنا ہے ان دروازوں کو مقفل کر کے پھر یہ رونا کیوں رویا جاتا ہے ہمارا ادب بہت پیچھے ہے۔ اس میں ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ لکھنے والے بہت کم ہیں وغیرہ وغیرہ" لکھنے والے کیسے پیدا ہوں گے۔ ادب میں کیسے ترقی ہوگی۔ جب ہر ایک صوبے سے سینکڑوں پرچے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ماتھے پر ہمیں خدمتِ ادب کا لیبل نظر آتا ہے۔ یہ پرچے پرچے نہیں ہیں۔ کاغذی کشکول ہیں۔ جن میں ہم سے اور دوسرے لوگوں سے بھیک ڈالنے کے لئے کہا جاتا ہے ایسے کشکول نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے وجود سے ہمارا ادب بالکل پاک ہو جانا چاہئے۔ آج ہی، ابھی ابھی!!

میں چاہتا ہوں ان تمام ہم پیشہ بھائیوں سے جن میں خودداری و خود اعتمادی کا

مادہ موجود ہے، کہوں گا کہ وہ ان تمام پرچوں سے اپنا قطع تعلق کرلیں جو ان کی محنت کے دام ادا نہیں کرتے۔ آج ہی ہمیں ان تمام پرچوں رسالوں اور اخباروں کے وجود سے انکار کر دینا چاہیئے۔ جو مفت خور ہیں ان رسالوں اور مقبروں میں کیا فرق ہے۔ جہاں کے مجاور ہر وقت جھولی پھیلائے نذر نیاز مانگتے رہتے ہیں۔ ہمیں نہ ایسے مقبروں کی ضرورت ہے اور نہ ایسے رسالوں اور اخباروں کی، جن سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

پریس کو جہاں یہ پلندے چھپتے ہیں، روپیہ ادا کیا جاتا ہے۔ کاتبوں کو جو لکھائی کرتے ہیں معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان مزدوروں کو ہر روز ہر ہفتے یا ہر مہینے مزدوری ادا کی جاتی ہے۔ جو ان کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ مگر مضمون نگاروں کو ان کی محنت کے دام ادا نہیں کئے جاتے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے۔

کیا مضمون نگار کی ضروریاتِ زندگی نہیں؟ کیا اسے بھوک نہیں لگتی؟ کیا اسے پہننے کو کپڑے نہیں چاہئیں؟ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اگر وہ انسان ہے تو پھر اس سے حیوانوں کا سا سلوک کیوں روا رکھا جاتا ہے۔

میں بغاوت چاہتا ہوں۔ ہر اس فرد کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں جو ہم سے محنت کراتا ہے مگر اس کے دام ادا نہیں کرتا۔

میں بغاوت چاہتا ہوں۔ زبردست بغاوت چاہتا ہوں کہ ہمارے ادب سے یہ بدعت بالکل دور ہو جائے۔ جس کی موجودگی میں مضمون نگار اپنی محنت کا معاوضہ طلب کرتے جھجکتا ہے۔ میں اس حجاب کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں جو سرمایہ دار

طبقے نے ہم لوگوں پر ایک زمانے سے اپنے فائدے کے لئے طاری کر رکھا ہے
میں اس احساس کے خلاف بغاوت چاہتا ہوں، جو اس حجاب نے ہمارے
دلوں میں پیدا کر دیا ہے۔ اس احساس کے خلاف جس کی موجودگی میں اکثر مضمون نگار
یہ خیال کرتے ہیں کہ مضمون نگاری محض شغل ہے ایسا شغل جو محض بے کار آدمیوں
کا کام ہے۔

ادب کی رونق ہمارے دم سے ہے۔ ان لوگوں کے دم سے نہیں ہے جن
کے پاس چھاپنے کی مشینیں، سیاہی اور ان گنت کاغذ ہیں۔ لٹریچر کا دیا ہمارے ہی
دماغ کے روغن سے جلتا ہے۔ چاندی اور سونے سے اس کی بتی روشن نہیں ہو سکتی
اگر آج ہم ...... ہم شاعر، افسانہ نگار اور مقالہ نویس اپنے قلم ہاتھ سے رکھ دیں
تو کاغذوں کی پیشانیاں تلک سے محروم رہیں۔

اگر ہمیں مضمون نگاری کو ایک معزز پیشہ بنانا ہے تو ہمیں اپنا احترام
مخالفین کی آنکھوں میں پیدا کرنا ہے۔ ہمیں لڑنا ہوگا۔ ہمیں ایک زبردست
جنگ کرنا ہوگی۔ ہمیں ہڑتال کرنا ہوگی۔ اپنے خیالات و افکار کی ہڑتال کرنا
ہوگی۔ ہمیں اس وقت تک اپنے جذبات و محسوسات اپنے اندر دبا کر رکھنا ہوں گے۔
جب تک پیاس کے مارے کاغذ کی زبان باہر لٹک نہ پڑے۔ بھوک کی شدت سے
اس کا بُرا حال نہ ہو جائے۔

آؤ ہم اپنا ایک محاذ بنائیں۔ سب اکٹھے ہو جائیں۔ اگر ہم سب اپنے قلم
ایک جگہ پر رکھ دیں تو ایک پہاڑ کھڑا ہو سکتا ہے۔ کیوں نہ ہم تعاون سے اس
بدعت کے خلاف آواز بلند کریں۔ جو ہمارے وقار پر ایک بدنما دھبا ہے۔ ہم

سوسائٹی میں اپنے لئے جگہ چاہتے ہیں اور بس۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری محنت کو معاوضے کے قابل سمجھا جائے اور ہمیں وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن کے ہم حق دار ہیں۔ ہمارا مطالبہ جائز ہے۔ پھر کیوں نہ ہم آج ہی سے اپنے حقوق مانگنا شروع کر دیں۔

آخر کب تک ادیب ایک ناکارہ آدمی سمجھا جائے گا۔ کب تک شاعر کو ایک گپیں ہانکنے والا متصوّر کیا جائے گا۔ کب تک ہمارے لٹریچر پر چند خود غرض اور ہوس پرست لوگوں کی حکمرانی رہے گی۔ کب تک؟

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ مجھے شکایت ہے اپنے مضمون نگار بھائیوں سے جن کی تحریریں دوسروں کی روزی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ مگر ان کے لئے ایک دھیلا بھی پیدا نہیں کرتیں۔ وہ مضمون لکھتے ہیں کسی اور حیلے سے پیٹ بھر کر وہ شعر لکھتے ہیں۔ کسی دوسرے کنوئیں سے اپنی پیاس بجھا کر، وہ مقالے لکھتے ہیں مگر اپنی ستر پوشی کا سامان حاصل کرنے کے لئے انہیں کوئی اور ہی کام کرنا پڑتا ہے ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان کے مضمون اُن کے شعر ان کے مقالے اُن لوگوں کی بھوک اور پیاس بجھاتے ہیں جو صرف انہیں کاغذ کے چند پرزوں پہ چھاپ دیتے ہیں۔ ان کی تحریریں دوسروں کا تن ڈھانکتی ہیں۔ مگر ان کے لئے کپڑے کی ایک چندی بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے ایسا نہیں ہو گا۔

ہمیں حالات کو بدلنا ہے اور ہم حالات کو بدل کر رہیں گے۔ ایک انقلاب برپا ہونا چاہئے۔ جو حالات کو پلٹ دے۔ ادیب اپنے قلم سے روزی کمائے۔

سقفِ نیلوفری کے نیچے وہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح خدا کی نعمتوں کو استعمال کریں اور لوگ اس کے پیشے کو احترام کی نظروں سے دیکھیں۔

زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ آؤ ہم بھی کروٹ بدلیں۔ اور ایک کروٹ میں وہ تمام بدعتیں جھٹک دیں جو ہمارے ساتھ چپک دی گئی ہیں۔ آؤ ہم ایک شان سے زندہ رہیں اور شان سے مریں۔ ہماری زندگی اور ہماری موت میں ایک امتیازی شان ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم شاندار ہیں۔ ہم ادیب ہیں۔ شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں قلم ہے جو تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔

حضرات! حالات بہت نازک ہو گئے ہیں۔ اب تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ بعض اہلِ قلم لوگوں نے دکانیں کھول لی ہیں۔ جہاں وہ خریداروں کے ہاتھ غزلیں مضمون اور افسانے بیچتے ہیں۔ آٹھ آٹھ آنے میں غزل بیچی جا رہی ہے۔ بیس بیس روپے میں ناول لکھنے کو لوگ تیار ہیں۔ پانچ روپے افسانے کا نرخ ہے۔ ایسی کئی دکانوں کا اشتہار آپ نے پرچوں میں پڑھا ہو گا۔ ان اشتہاروں کا معاوضہ یہ لوگ مضامین اور غزلوں کی صورت میں ادا کرتے ہیں یہ صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم لوگ غافل ہیں۔ ہم نے اپنی پوزیشن خود گرا رکھی ہے۔

لیکن حالات ایک منٹ میں سدھر سکتے ہیں۔ چٹکی بجانے کے عرصے میں ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر سکتے ہیں۔ بہت ہی کم عرصے میں ہم اپنے لئے ایک خوبصورت دنیا بنا سکتے ہیں۔ جس میں ہم کو ہر طرح کی آزادی ہو گی۔ کیا

ارادہ ہے آپ کا؟

میں کہتا ہوں اٹھو اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑ دو۔ ان کے کانوں تک میرا پیغام پہنچاؤ۔ ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ۔ اپنا ایک محاذ بناؤ اور جنگ شروع کر دو۔ اپنے قلموں کو کچھ عرصے کے لئے روشنائی سے دور رکھو۔ کاغذ کی دنیا تمہارے قدموں پر سر رکھ دے گی۔

شریف عورتیں اور فلمی دنیا

جب سے ہندوستانی صنعتِ فلم سازی نے کچھ وسعت اختیار کی ہے، سماج کے بیشتر حلقوں میں یہ سوال بحث کا باعث بنا ہوا ہے کہ شریف عورتوں کو اس ملکی صنعت سے اشتراک کرنا چاہئے یا نہیں؟

بعض اصحاب اس صنعت کو کسبیوں اور بازاری عورتوں کی "نجاست" سے پاک کرنے کے پیشِ نظر اس بات کے حق میں ہیں کہ شریف عورتیں بیش از بیش سنیما کے نقرئی پردے پر آنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو سنیما لائن سے شریف عورتوں کا اشتراک ایک لمحے کے لئے گوارا نہیں کرتے اور اسے ایک گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اول الذکر ملکی صنعت کو پاک کرنے کے شاندار جذبے کے زیرِ اثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس نجاست کو وہ ایک چہرے سے دور کرنا چاہتے ہیں، وہ دوسرے چہرے پر ویسی کی ویسی جمی رہتی ہے۔ فلمی کارخانوں سے کسبیوں کو باہر نکال دینے سے وہ بازار بند نہیں ہوتے جہاں یہ عورتیں مردوں کے پاس اپنی

اجناس فروخت کرتی ہیں۔

مؤخر الذکر جو اسٹیڈیو کی گندی فضا میں شریف عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں دیتے، اس مبتلا و مطہر جذبے کی شدت کے باعث یہ حقیقت بالکل بھول جاتے ہیں کہ وہ بدچلن عورتیں جو سنیما کے پردوں پر آتی ہیں اور جن کے گانوں اور ایکٹنگ سے وہ اپنے تھکے ہوئے دماغوں کو راحت بخشتے ہیں، جن کے آرٹ سے وہ علم حاصل کرتے ہیں، کسی زمانے میں شریف عورتیں ہی تھیں۔

اگر چکلے کی کوئی عورت اپنا کاروبار چھوڑ کر کسی فلم کمپنی میں داخل ہو جاتی ہے اور اس نئی لائن میں اپنا کام بطریقِ احسن کرتی ہے تو ہمیں یا آپ کو اس کے اس اقدام پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بازاری عورتیں سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے وضع کردہ قوانین کی کھاد ان کی پرورش کرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں بیگانہ تصور کیا جائے اور کیوں ان کی موت کی تدبیریں سوچی جائیں جب کہ وہ سماج کا ایک حصہ ہیں، اس کے جسم کا ایک عضو ہیں۔ اگر ان کو اچھا بنانا درکار ہے تو سارے جسم کے نظام کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک سماج اپنے قوانین پر از سرِ نو غور نہ کرے گا وہ "نجاست" دور نہ ہو گی جو تہذیب و تمدن کے اس زمانے زمانے میں ہر شہر اور ہر بستی کے اندر موجود ہے۔

سانس کا زیر و بم قائم رکھنے کے لئے دفتر کا بے ضرر کلرک سارا دن حساب کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور رجسٹروں کا غذ سیاہ کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندہ رہنے کے لئے شہر کا مے فروش دن بھر قانون کے سائے تلے شراب بیچتا ہے۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ راستے جدا جدا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اگر ہمارے دفتر کے بے ضرر

کلرک کو ایسے ذرائع میسر آتے یا حالات کچھ اس قسم کے ہوتے تو وہ مے فروشی شروع کر دیتا۔ کیا وجہ ہے کہ عورتوں کا جسم بیچنا حیرت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کا وجود ہرگز ہرگز حیرت خیز یا نفرت انگیز نہیں ہے۔

ہماری شریف عورتوں کی شرافت اس لئے برقرار ہے کہ انہوں نے بالکل جدا قسم کے ماحول میں پرورش پائی۔ والدین کے سایۂ عاطفت سے نکل کر وہ اپنے کماؤ شوہروں کے پاس چلی آئیں اور زندگی کے پُرپیچ راستوں سے بالکل الگ تھلگ رہیں۔

جن شریف عورتوں کو والدین کا سایۂ عاطفت نہ ملا۔ جو تعلیم سے بے بہرہ رہیں، جن کو خود اپنا پیٹ بھرنے کا سامان کرنا پڑا وہ سڑک کے پتھر کی طرح جدا ہو گئیں۔ انہیں لامحالہ ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ کچھ مقابلے کی تاب نہ لا کر مر گئیں، کچھ سڑکوں پر بھیک مانگنے لگیں، کچھ ہسپتالوں میں داخل ہو گئیں۔ کچھ محنت مزدوری کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالنے لگیں اور کچھ زندگی کی ایک آگ سے گذر کر ایک ایسے تنور میں جا گریں جو ہمیشہ گرم رہتا ہے، یعنی وہ بیسوا بن گئیں۔

ویشیا پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے یا خود بنتی ہے۔ جس چیز کی مانگ ہوگی منڈی میں ضرور آئے گی۔ مرد کی نفسانی خواہشات کی مانگ عورت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ چنانچہ اس مانگ کا اثر یہ ہے کہ ہر شہر میں کوئی نہ کوئی چکلہ موجود ہے۔ اگر آج یہ مانگ دور ہو جائے تو یہ چکلے خود بخود غائب ہو جائیں گے۔

جو نظریہ ہمارے نام نہاد وقار پسند حضرات نے ویشیاؤں کے متعلق قائم کر رکھا ہے، بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس میں اپنے ذاتی وقار، ذاتی تعزز اور ذاتی تشخص

برقرار رکھنے کے جذبے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ چونکہ مرد کے ہاتھ میں اکثر و بیشتر اختیارات کی باگ ڈور ہے، اس لئے وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ سوسائٹی کے اصولوں کے مطابق مرد مرد رہتا ہے خواہ اس کی کتاب زندگی کے ہر ورق پر گناہوں کی سیاہی لپی ہو، مگر وہ عورت جو صرف ایک مرتبہ جوانی کے بے پناہ جذبے کے زیر اثر کسی اور لالچ میں آکر یا کسی مرد کی زبردستی کا شکار ہو کر ایک لمحے کے لئے اپنے راستے سے ہٹ جائے، عورت نہیں رہتی۔ اسے حقارت و نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ سوسائٹی اس پر وہ تمام دروازے بند کر دیتی ہے جو ایک سیاہ پیشہ مرد کے لئے کھلے رہتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں اگر عورت کی عصمت ہے تو کیا مرد اس گوہر سے خالی ہے؟ اگر عورت عصمت باختہ ہو سکتی ہے تو کیا مرد نہیں ہوتا؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے تیروں کا رُخ صرف عورت کی طرف ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسٹوڈیو میں دلشیاؤں کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ کیا یہ کہنا دبی زبان میں اس بات کا اقرار نہیں کہ مردوں کو اپنے آپ پر قابو نہیں ہے اور کیا یہ اس حقیقت کا ثبوت نہیں کہ مرد عورت کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور اور بہ آسانی سے بہک جانے والا ہے۔

اسٹوڈیو میں عورتوں اور مردوں کا یکجا رہنا ضروری ہے۔ فریقین کا باہمی اختلاط خوشگوار نتائج کا موجب ہو سکتا ہے۔ اگر جسمانی خواہشات کی تکمیل کو نصب العین کا ایک لازمی جزو خیال نہ کیا جائے۔ اگر مرد اپنے جذبات قابو میں رکھے تو

عورت کوشش کے باوجود قضا ملکہ نہیں کر سکتی۔

جو حضرات شریف عورتوں کو فلم لائن میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ میں ان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ شرافت سے ان کی کیا مراد ہے۔ کیا وہ عورت جو قانون کی اس دنیا میں سربازار اپنا مال بیچتی ہے اور کوئی دھوکا نہیں دیتی، شریف نہیں ہے؟

اگر شرافت کے معنی باعصمت ہونے کے لئے جاتے ہیں تو میں ان لوگوں سے جو شریف عورتوں کو فلم اسٹڈیو میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ایکٹرس کے لئے باعصمت ہونا کیا ضروری خیال کرتے ہیں؟ ۔ کیا جذبات نگاری اور تمثیل نگاری کے لئے عورت میں عصمت کی برقراری ضروری ہے؟ اگر ان کا یہی خیال ہے تو یہ بالکل باطل ہے اور ان کے ادراک کی کمزوری کا باعث ہے۔

جذبات نگاری اور ایکٹنگ کے لئے ایکٹر اور ایکٹرس کو دنیا کے بیشتر نشیب و فراز سے آگاہ ہونا ازبس ضروری ہے۔ کوئی شریف عورت کیمرے کے سامنے اپنے فرضی عاشق کی جدائی کے اثرات اپنے چہرے پر پیدا نہیں کر سکتی جب تک وہ اسی قسم کے حادثے سے پہلے دوچار نہ ہو چکی ہو۔ جو عورت غم سے ناآشنا ہے وہ غم کے اثرات خود پر کس طرح طاری کر سکتی ہے؟

ایکٹرس بننے سے بیشتر عورت کو عشق و محبت کی تلخیوں اور مٹھاسوں کے علاوہ اور بہت سی چیزوں سے آشنا ہونا چاہیئے اس لئے کہ جب وہ کیمرے کے سامنے آئے تو اپنے کیریکٹر کو اچھی طرح ادا کر سکے۔

حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہمیں فلمی فن کی ترفیع مقصود ہے، اگر ہم اس فن کو چمکانا چاہتے ہیں اور اسے غلط خطوط پر چلانے کے متمنی نہیں ہیں تو ہمیں اپنی نظر بلند رکھنا پڑے گی۔ گناہ یا ثواب انسان کی ذات سے متعلق ہے، اس سے فن کو کوئی واسطہ نہیں۔ فلم لائن پر شریف عورتوں کا قبضہ ہو یا غیر شریف عورتوں کا، مطلب صرف اس سے ہے کہ ہمارے فلم زندگی کے آئینہ دار ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ حسن فروشی اور جسم فروشی اچھی چیز ہے۔ میں اس بات کی وکالت بھی نہیں کرتا کہ ان ویشیاؤں کو فلم کمپنیوں میں جوق در جوق داخل ہونا چاہئے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں یا جو کچھ میں کہہ چکا ہوں نہایت واضح اور صاف ہے۔

کامیاب ایکٹرس بننے کے لئے ہر عورت کو آزمودہ کار ہونا چاہئے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ تصویر زندگی کے روشن و تاریک دونوں پہلوؤں سے آشنا ہو۔ اس کے آبگینہ دل پر اگر حادثات نے لکیریں نہیں کھینچیں، اگر اس کے حافظے کی تختی پر متنوع حوادث کے نقوش موجود نہیں تو وہ کسی صورت میں اچھی اور کامیاب ممثلہ نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر لکھ چکا ہوں، ایکٹرس بننے کے لئے عورت کو زندگی کی سرد اور گرم لہروں سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

ایکٹرس چکلے کی ویشیا ہو یا کسی باعزت اور شریف گھرانے کی عورت، میری نظروں میں وہ صرف ایکٹرس ہے۔ اس کی شرافت یا رذالت سے مجھے کوئی سروکار نہیں، اس لئے کہ فن ان ذاتی امور سے بہت بالاتر ہے۔

چکلے کی ویشیا نہایت بلند پایہ ادیب ہو سکتی ہے۔ اس کے خیالات و افکار سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ایک گرہستی تعلیم یافتہ عورت کی شرافت

نہایت ہی مہلک نتائج کا موجب ہو سکتی ہے۔

بغاوتِ فرانس میں پہلی گولی پیرس کی ایک ویشیا نے اپنے سینے پر کھائی تھی۔ امرت سر میں جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کی ابتدا اس نوجوان کے خون سے ہوئی تھی جو ایک ویشیا کے بطن سے تھا۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ہندوستانی صنعتِ فلم سازی پر ایک نظر

۱۹۱۳ء میں مسٹر ڈی، جی پھالکے نے ہندوستان کا پہلا فلم بنایا اور اس صنعت کا بیج بویا۔ دادا پھالکے نے آج سے پچیس برس پہلے اپنی دھرم پتنی کے زیورات بیچ کر جو خواب دیکھا تھا ان کی نگاہوں میں یقیناً پورا ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ خواب جو ملک کے ترقی پسند نوجوان دیکھ رہے ہیں، ابھی تک ان کی تعبیر عملی شکل میں نظر نہیں آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملک کی اس لطیف صنعت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کے دل و دماغ پر بڑھاپا طاری ہے جو صرف گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور جن کو آگے بڑھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ کسی صنعت کو بامِ رفعت تک پہنچانے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہوتی، جن کا تخیل زنگ آلود ہو اور جن کی زندگی ٹھہرا پانی بن کر رہ گیا ہو۔

نوجوانانِ وطن، جن کی میں نمائندگی کر رہا ہوں، ملک کے وہ نوجوان جو سازِ حیات کے ہر تار کو چھیڑ کر نغمے پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ وطن کے وہ نوجوان جو بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتے ہیں، ہندوستان کے باغ کے وہ پرندے جو اپنے کترے ہوئے

پروں کے باوجود اڑنا چاہتے ہیں۔ اپنے ملک کی اس صنعت کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہیں۔ وہ بے عقل بچے سہی، تجارتی رازوں سے ناواقف سہی، مفلس سہی لیکن جو تڑپ ان کے سینے میں ہے، جو خواہش ان کے دل میں کروٹیں لیتی ہے، جو اضطراب ان کے تمتماتے ہوئے چہروں پر کھیلتا ہے۔ یقیناً قابلِ احترام ہے اور تمام وزنی جیبوں والے سرمایہ داروں کو جو انڈین موشن پکچر کانگرس میں اپنی تجوریوں کی نمائش کرنے آئے تھے۔ ایک سکنڈ کے لئے احتراماً ملک کے ان پاگل لونڈوں کے دیوانے جذبے کے آگے سر جھکا دینا چاہئے تھا۔

ہندوستان کے ان ترقی پسند نوجوانوں کو بیمار کہا جاتا ہے ——— وہ بیمار ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، پر یہ بیماری وہ عشق ہے جو ان کو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے ہے۔ ان کو دیوانہ کہا جاتا ہے، وہ دیوانے ہیں، اس لئے کہ وہ اپنے وقت کے قائدین کی ہوشمندی سے مطمئن نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے وطن کے رتھ میں سب کے سب جُت کر اسے اس مقام پر پہنچا دیں، جہاں دوسرے ملک کھڑے ہیں۔ اور اس کے لئے وہ اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ سرمایہ داروں کے ہر کھنکھناتے ہوئے سکّے کے مقابلے میں وہ اپنی جوان رگوں کا چمکیلا خون پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ دیوانگی ہے۔ مگر اس دیوانگی کا احترام کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی ہوشمندی، متانت اور سنجیدگی، ٹھٹھرے ہوئے بدن کو گرمانے کے لئے دیوانگی کی اس آگ کی ہر وقت ضرورت ہے۔

ہمیں اچھے فلم چاہئیں، ہمیں بلند فلم چاہئیں، جو ہم غیر ممالک کے فلموں کے مقابلے میں پیش کر سکیں۔ ہم لوگوں کو یہ خبط ہے، اس بات کی دیوانگی ہے

کہ ہمارے وطن کی ہر شے دوسروں کے مقابلے میں اچھی ہو۔ یہ خبط ہماری زندگی کی اصلی گرمی ہے اور ہم اس گرمی کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔

انقلاب سے پہلے روس کے حالات ہندوستان سے بدتر تھے، روس میں ادب اور شاعری کا نام ونشان تک نہ تھا مگر اس نے ایک نہایت ہی قلیل عرصے میں وکی پیدا کئے۔ میر اور غالب پیدا کئے۔ صنعتِ فلم سازی میں بھی ان کی ترقی قابلِ رشک ہے۔ روس نے ایسے ایسے ڈائرکٹر پیدا کئے ہیں کہ اُن پر فکر انسان ہمیشہ بجا طور پر نازاں رہے گا۔ پر ہمارے ملک نے ان پچیس برسوں میں جن کے نو ہزار ایک سو پچیس دن ہوتے ہیں، کیا کیا ہے؟

کیا ہم ان پچیس برسوں کا حاصل ان ڈائرکٹروں کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں جو اپنے فلموں کا منہ مانگے ہوئے لقموں سے بھرتے ہیں؟ —— کیا ہم ان افسانہ نویسوں پر تھوڑی دیر کے لئے بھی فخر کر سکتے ہیں جو دوسروں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پہ ٹیڑھی ترچھی ننگی لکیریں کھینچتے ہیں؟

کیا ہم ان فلموں کو دوسرے ممالک کے فلموں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ جو امریکی فلموں کی ہزارویں کاربن کاپی معلوم ہوتی ہے؟

ہرگز نہیں۔ ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننے چاہئیں۔ ہمارے وہ سوشل فلم جو آج کل سینکڑوں کی تعداد میں سینماؤں کے پردوں پر چلتے ہیں، کیا ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں؟ اس کا جواب موٹے قلم سے یہ ہونا چاہئے "نہیں"! آپ ان فلموں میں کبھی "ہندوستانیت" کو امریکی لباس میں دیکھتے ہیں اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے، جو بے حد مضحکہ خیز ہے، ان کو سوشل فلم کہا جاتا ہے، ٹھیک

اسی طرح جس طرح ہر ایکٹر خود کو آرٹسٹ کہتا ہے۔

ہندوستان میں ابھی تک آرٹ کے صحیح معانی پیش نہیں کئے گئے۔ آرٹ کو خدا معلوم کیا چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں آرٹ ایک رنگ سے بھرا ہوا برتن ہے۔ جس میں ہر شخص اپنے کپڑے بھگو لیتا ہے، لیکن آرٹ یہ نہیں ہے اور نہ وہ تمام لوگ آرٹسٹ ہیں جو اپنے ہاتھوں پر لیبل لگائے پھرتے ہیں۔ ہندوستان میں جس چیز کو آرٹ کہا جاتا ہے، ابھی تک میں اس کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیا ہے؟

ہندوستانی صنعتِ فلم سازی میں جن دو لفظوں کے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا ہے، ان میں سے ایک آرٹ یا آرٹسٹ ہے اور دوسرا شاہکار۔ ڈائرکٹر سے لے کر اسٹڈیو میں تختے ٹھونکنے والے مزدور تک سب کے سب آرٹسٹ ہیں "ہریشچندر" سے لے کر "ستارہ" تک جتنے فلم بنے ہیں، سب کے سب شاہکار ہیں۔ اس سے یہ ہوا ہے کہ آرٹ اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھا ہے اور شاہکار شاہکار نہیں رہا۔

فلم اور پروڈیوسر

ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی دگرگوں حالت کے متعلق آئے دن اخبارات اور رسائل میں تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں مگر پریس کی اس آواز سے ملک کی اس صنعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر و بیشتر اخبارات کے پیشِ نظر ترقیِ صنعت کے جذبے کے بجائے جلبِ منفعت رہنے۔ اس میں ایسے اخباروں اور اخبار نویسوں کا کوئی قصور نہیں، جن کے کاغذ اور جن کے قلم پروڈیوسروں کی میزانوں میں تُلتے ہیں۔ دراصل ہر شخص کساد بازاری کے اس زمانے میں کسی نہ کسی حیلے سے اپنی روزی کمانا چاہتا ہے اور جب فلمی دنیا میں فلمی خداؤں کے آگے

مرجھکانے سے چاندی کے سکے مل جاتے ہیں تو کورنشوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

ہندوستان میں سینکڑوں کی تعداد میں اخبارات و رسائل چھپتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صحافت اس سرزمین میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہمیں متذکرہ صدر الفاظ میں اپنی کمزوریوں کا اظہار نہ کرنا پڑتا۔ صحافت اپنی فطری شکل خود بخود اختیار کرے گی۔ جب ہمارے ملک سے جہالت دور ہو جائے گی اور جہالت صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے جب دانشگاہوں کے سب دروازے عوام پر کھول دیئے جائیں گے۔

عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان سب میں سے فلم کو متفقہ طور پر بہت با اثر تسلیم کیا گیا ہے۔ سیلولائڈ کے فیتے کے ذریعے سے ہم پبلک تک اپنا پیغام بطریق احسن پہنچا سکتے ہیں۔ نصاب کی بھاری بھرکم کتابیں طلباء کے سینے پر بوجھ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اسکول کے اوقاتِ تعلیم میں ہمارے اکثر بچے دل سے سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکچر کالج کے بعض لڑکے لڑکیوں کے دماغ پر اثر کرنے کے بجائے ان کے اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ فلم سے بددلی کا اظہار بہت کم کیا جاتا ہے۔ جو بات مہینوں میں خشک تقریروں سے نہیں سمجھائی جا سکتی، چٹکیوں میں ایک فلم کے ذریعے سے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے۔

فلم کے عالمگیر اور ہمہ رس اثر کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی عوام کے اذہان کو بیدار کرنے کے لئے ایسے فلموں کی ضرورت ہے جو کوئی نئی بات سکھائیں اور جن کو دیکھ کر تماشائی تفریح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سنیما ہال سے باہر نکلتے وقت اپنے دماغوں کی آغوش میں غور و فکر کے جراثیم بھی لیتے جائیں جس طرح جسمانی

صحت برقرار رکھنے کے لئے کسرت کی ضرورت ہے، ٹھیک اسی طرح ذہن کی صحت برقرار رکھنے کے لیئے ذہنی ورزش کی ضرورت ہے۔

مقامِ تاسف ہے کہ ہمارے فلمی پروڈیوسروں کے پیشِ نظر سوائے تجارت کے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ درست ہے کہ تاجروں کو صرف حصولِ زر سے مطلب ہوتا ہے اور ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں، مگر ہم کور ذوقی اور پست مذاق کا گلہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارے اکثر پروڈیوسر اپنے نگارخانوں میں تیسرے درجے کے فلم بنا کر پردے پر پیش کرتے ہیں، صرف اس خیال سے کہ اس قسم کے لچر فلم پبلک کی جیبوں سے زیادہ رقم وصول کر سکتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ مذاق پیدا کیا جاتا ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوتا۔ اگر پبلک میں پست مذاق کے لوگ موجود ہیں تو اس کے ذمہ دار ہمارے پروڈیوسر ہیں جو مذاق کو پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔

جادو کے لایعنی قصّے اور پریوں کی فرضی کہانیوں میں اتنی دل چسپی نہیں ہے جتنی کہ ہمارے پروڈیوسر سمجھتے ہیں۔ پبلک ایسی فلم چاہتی ہے جن کا تعلق براہِ راست ان کے دل سے ہو۔ جسمانی حسیات سے متعلق چیزیں زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں مگر جن چیزوں کا تعلق روح سے ہوتا ہے، دیر تک قائم رہتی ہیں۔ ماسٹر وٹھل کے اسٹنٹ تماشائیوں کے ذہن سے بالکل نکل چکے ہیں۔ اب وہ روحانی خوراک کے لئے خالی ہیں۔

ہمیں اس وقت ایسے فلم درکار ہیں، جو ہمیں کچھ سکھائیں۔ ایسے فلم نہیں چاہئیں جو ہمیں سب کچھ بھلا دیں۔ جو ہمارے اذہان کو زنگ آلود کر دیں۔ ہمیں اپنی زبان سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ ہمیں اپنے وطن سے پیار کرنے کا سبق دیا جائے۔ ہمیں محبت کے

حقیقی معنوں سے آشنا کرایا جائے، ہمارے سامنے کتابِ انسانیت کے اوراق کھولے جائیں۔ کیا ہمارے پروڈیوسر ایسا نہیں کر سکتے؟ کیا وہ اپنی تجارت کو ہماری مانگ کے ساتھ ساتھ اور زیادہ نہیں بڑھا سکتے۔

اختصار کی ضرورت

ہمارے یہاں خاموش فلموں کے زمانے سے لے کر اب تک جتنے فلم بنے ہیں ان کی غیر معمولی طوالت دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہمارے پروڈیوسر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پبلک غیر معمولی طور پر لمبے فلم پسند کرتی ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ صداقت ہو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسے طول طویل فلموں کی نمائش سے جہاں صنعتِ فلم سازی کی ترقیع میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، وہاں تماشائیوں کے اذہان پر بھی اس کا برا اثر پڑ رہا ہے۔ آج کل وہ زمانہ ہے جس میں اختصار کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کم سے کم وقت میں مطلب حل کرنا آج کل ہر شخص کے پیشِ نظر ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے فلموں میں جو بات سات یا آٹھ ہزار فٹ سیلولائڈ میں کہی جا سکتی ہے اسے پندرہ یا سولہ ہزار فٹ لمبے فیتے میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ایک افسانے کو جس کے سارے ابواب آٹھ ہزار فٹ لمبے فلم میں سما سکتے ہیں اگر ربڑ کی طرح کھینچ کر سولہ ہزار فٹ لمبا بنا دیا جائے گا تو اس میں وہ بات نہ رہے گی جو اس کی فطری طوالت میں تھی۔ افسانے کی حدود سے جو کوئی باہر نکلنے کی کوشش کرے گا، اچھا افسانہ گو نہیں بن سکتا۔ جس طرح ربڑ کا فیتہ ایک خاص حد تک کھینچا جا سکتا ہے اسی طرح افسانے بھی ایک خاص حد تک کھینچ کر بڑے کئے جا سکتے ہیں اور اگر ہم اس حد سے گزر جائیں گے تو بیچارے افسانے کی ساری ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ

جائیں گی اور سب کا سب منتشر ہو جائے گا۔

غیر فطری طور پر لمبے فلم میں ڈائرکٹر خواہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو۔ افسانے کو اپنے محور پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ فلم طویل ہو گا تو اس میں قدرتی طور پر ڈائیلاگ بھی لمبے لمبے ہوں گے اور ایکٹران کی ادائیگی میں یک آہنگی برتنے لگیں گے۔ فلم طویل ہو گا تو اس کے حادثات اور واقعات بھی طویل ہوں گے۔ جس کے باعث فلم کی رفتار میں لنگڑاپن پیدا ہو جائے۔ جو آنکھوں کو بہت بُرا معلوم ہو گا۔

طویل فلم کی تیاری میں زیادہ سیٹنگ استعمال ہوتے ہیں۔ جن پر کافی روپیہ خرچ آتا ہے۔ اس طرح وہ فلم جو اپنی صحیح شکل میں ساٹھ یا ستر ہزار روپے میں بن سکتا ہے۔ ایک لاکھ روپے میں تیار ہو گا اور ناکام رہنے کی صورت میں پروڈیوسروں کی کمر توڑ کے رکھ دے گا۔ طویل فلم میں دلچسپی کا عنصر داخل کرنے کے لئے پروڈیوسرز اور ڈائرکٹر وں کو بے موقعہ اور بے محل گیت گوانے اور ناچ نچوانے پڑتے ہیں۔ یہ فلم کو خوبصورت بنانے کے بجائے نہایت بھدا بنا دیتے ہیں۔ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس کا باعث صرف یہ حقیقت ہے کہ ہر شے کے لئے ایک مناسب و موزوں جگہ ہوتی ہے۔ جس سے ہٹ کر وہ اپنی تمام خوبصورتی کھو دیتی ہے۔ تماشائیوں کو اگر ایسے طویل فلموں کا عادی بنا دیا گیا تو ان کے اذہان میں طوالت پسندی گھر کر جائے گی اور وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں بھی اس عادت کو داخل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس کے نتائج بہت تنزل آفریں ثابت ہوں گے۔

متذکرہ صدر امور کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ہمارے پروڈیوسر اپنے فلموں کی تیاری میں اختصار سے کام لیں۔ آج کل سولہ سترہ ہزار فٹ لمبے فلم پر جو کچھ وہ

خرچ کر رہے ہیں، اگر وہی کچھ اس سے نصف طویل فلم پر خرچ کیا جائے تو ملک کی صنعتِ فلم سازی میں ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور ان لوگوں کی تمام شکایتیں دور ہو سکتی ہیں۔ جو اس وقت ہمارے فلموں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

سنیما ہال میں تماشائیوں کے لئے دو گھنٹہ کا پروگرام پیش کرنے کے لئے ہمارے پروڈیوسروں کو ان خطوط پر چلنا چاہئے، جو ہالی وڈ کے پروڈیوسروں کے پیش نظر ہیں۔ سات آٹھ ہزار فٹ لمبے فلم کے ساتھ کارٹون یا خبروں کے ایک چرخے یا دو چرخے فلم تیار کئے جائیں جیسا کہ یورپ میں کئے جاتے ہیں۔ اس طرح پبلک جہاں قصے کہانیاں سنے گی، اور دیکھے گی۔ وہاں دوسرے ممالک کے تازے ترین حالات سے باخبر بھی رہے گی۔ ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ اپنے ہمسایہ ممالک سنیما ہال میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیں گے، اور ان کے دل سے وہ تعجب دور ہو جائے گا جو عام طور پر فاصلہ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ بیس پچیس سال تک ہم طول طویل فلم دیکھتے رہے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس بدعت کا خاتمہ کر دیا جائے اور رہباری بھرکم اور شیطان کی آنت کی طرح لمبے فلموں کے بجائے ایسے مختصر فلم پیش کئے جائیں، جو ہمارے دماغوں پر وزن نہ ڈالیں۔ وطن کی اس صنعت کو رفعت بخشنے کے لئے اختصار کی بے حد ضرورت ہے۔

ستارے یا ستارہ شناس

تیس برس سے ہالی وڈ کے اربابِ فکر اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ فلم سازی میں اسٹار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا خود فلم کو۔ اس مسئلے پر اس قدر بحث کی جا چکی ہے کہ اب اس کے تصور ہی سے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔

آخر متذکرہ صدر سوال کا فیصلہ کُن جواب کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے یہ سوال سُن کر یوں کہہ دیا جائے "کیا فرمایا آپ نے؟

مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا؟ ـــ اگر اس کا جواب کچھ ہو سکتا ہے تو یقیناً اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اسٹار زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا خود فلم۔

فرینک کیپرا کولمبیا فلم کمپنی کے ماہر فن ڈائرکٹر نے حال ہی میں اس مسئلے پر اپنے افکار انگریزی اخبارات میں شائع کئے ہیں۔ مسٹر کیپرا کہتے ہیں "میں ان لوگوں کا ہم خیال ہوں جو فلم کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ فلم اسٹار بناتے ہیں اور درخشاں سے درخشاں ستارہ کمزور یا بُرے فلم کو ناکامی سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

تجربے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فلم ستارہ ساز ہے اور ستارے کمزور فلم کو تابانی نہیں بخش سکتے۔ مگر ہمارے یا مسٹر کیپرا کے خیال سے سب متفق نہیں ہو سکتے۔ ایسے سینکڑوں اصحاب موجود ہوں گے جو اپنے نظریے کے جواز میں اور مسٹر کیپرا کے نظریے کے ابطال میں ٹھوس دلائل و براہین پیش کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ستارے کیوں کر بنتے ہیں یا وہ کون سی چیز ہے جو ستارے بناتی ہے؟

مسٹر کیپرا نے اس سوال کا جواب نہایت دلچسپ انداز میں دیا۔ آپ کہتے ہیں:۔

"اگر دنیا کے تمام پروڈیوسر اپنا سرمایہ جمع کر کے میرے حوالے کر دیں (جو یقیناً کافی وافی ہوگا) اور مجھ سے یہ کہیں کہ ہمارے فلمی آسمان کے لئے تین ستارے چن کر لا دو۔ تو میں یقیناً خالی الذہن ہو جاؤں گا۔ اس لئے کہ مجھے وہ جگہ معلوم ہی نہیں۔ جہاں سے یہ ستارے مل سکتے ہیں۔"

خاموش فلموں کے زمانے میں ہالی وڈ کے آسمانِ فلم کے لئے ستارے عام طور پر ہوٹلوں کارخانوں اور دفتروں وغیرہ سے آتے تھے۔ لیکن اب کہ فلموں کی خاموشی تکلم میں تبدیل ہو چکی ہے اور اس صنعت کو کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے۔ ستاروں کی سپلائی بہت کم ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں صنعتِ فلم سازی کے آغاز میں قحبہ خانے تھیٹر اور چکلے ستارے مہیا کیا کرتے تھے اور اب کہ ہماری صنعت کو کسی قدر فروغ حاصل ہوا ہے، علمی طبقے نے بھی ہمارے فلمی آسمان کے لئے ستارے پیش کرنے شروع کئے ہیں۔ اور مستقبل بعید یا مستقبل قریب میں ایک ایسا وقت آئے گا۔ جب ہالی وڈ کی طرح یہاں بھی ستاروں کی سپلائی کم ہو جائے گی۔

مگر ہم یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کون سی شے ہے جو ستارے بناتی ہے؟

مسٹر فرینک کیپرا کی (جن کی ڈائرکشن میں ہالی وڈ کے بڑے بڑے نامور ستارے کام کر چکے ہیں) رائے ہے کہ کرداروں کی صحیح تقسیم (یعنی موزوں و مناسب کاسٹ) ستارے بناتی ہے۔

ان کے نظریئے کے اعتبار سے چینی آدمی کا روپ صرف چینی ہی بطریقِ احسن دھار سکتا ہے۔ اور لنگڑے یا کبڑے آدمی کا پارٹ صرف لنگڑا یا کبڑا آدمی ہی خوبی سے ادا کر سکتا ہے۔

ہمیں مسٹر کیپرا کے اس نظریے سے اتفاق ہے۔ اسکرین پر کسی کیریکٹر کی ادائیگی کے لئے اتنا ہی زیادہ انہیں کامیابی کا موقع ملے گا۔ جس آسانی سے ہم اور آپ اپنے آپ یعنی اپنے اصل کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس آسانی سے ہم کسی اور کی نقل نہیں کر سکتے جہاں تصنع اور بناوٹ کو دخل ہو گا وہاں اصلیت برقرار نہیں رہ سکتی۔

اس نظریے کے جواز میں مسٹر فرینک کیپرا نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، جن میں سے ایک گیری کوپر کی ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ گیری کوپر اسکرین پر اپنے آپ کو اصلی رنگوں میں پیش کرتا ہے اور چونکہ وہ ایک خوش ذوق، عالی خیال اور صاحب فہم انسان ہے، اسی لئے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب رہتا ہے۔

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ موزوں و مناسب کاسٹ ستارے بناتی ہے۔ مگر یہ قطعی اور آخری فیصلہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ صرف کاسٹ کا موزوں و مناسب ہونا ہی کسی فلم کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ فلم کی کامیابی کے لئے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، جن کو آپ بخوبی سمجھتے ہوں گے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب تک مشینری کے سب پرزے اپنی اپنی جگہ پر اچھا کام نہ کریں گے۔ فلم کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کرداروں اور ٹیکنیشنوں کا باہمی اتحاد پکچر کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے جس طرح قیمتی سے قیمتی گھڑی ایک ٹک کرنے سے بھی انکار کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے کسی پرزے کے ساتھ میل کا ایک ننھا سا ذرہ چمٹا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح قیمتی سے قیمتی فلم، ایک حقیر اور معمولی سی فروگذاشت یا غلطی کے باعث فیل ہو جاتے ہیں۔

صحیح کاسٹ ستارے بنانے میں دیگر عناصر سے کہیں زیادہ ممد و معاون ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد یقیناً ہمارے ہم نوا ہو جائیں گے۔ چنانچہ فلموں کو کامیاب بنانے اور ستارے پیدا کرنے کے لئے ہمیں ستارہ شناس نگاہوں کی ضرورت ہے۔

اہلِ طرز ڈائرکٹر

ہندوستانی فلموں کی بے جانی کا سب سے بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اہلِ طرز یعنی سٹائلسٹ ڈائرکٹروں کی کمی ہے۔ افسانہ نگاری اور شعر گوئی کے لئے ایک اسٹائل کی ضرورت ہے جو ادب کے جملہ لوازمات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اسٹائل ہی ایک شاعر اور دوسرے شاعر کے شعروں کے درمیان حدِ تمیز کھینچتا ہے اور اسٹائل ہی ایک افسانہ نگار کی کہانی کو دوسرے قصہ نویس کے افسانے کے مقابلے میں ایک جداگانہ حیثیت بخشتا ہے۔ اسی طرح فلموں کے ڈائرکٹر کے لئے اسٹائل کی بہت ضرورت ہے۔ اگر ڈائرکٹروں کا اپنا اپنا اسٹائل نہ ہوگا تو فلم متحرک تصاویر کے یک آہنگ فیتے بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستانی فلم ایک عرصے سے اسکرین پر پیش ہو رہے ہیں۔ ان میں سے گنتی کے چند فلم ایسے ہیں، جن میں ہمیں ڈائرکٹروں کا اسٹائل نظر آتا ہے۔ اسی اسٹائل کے ذریعہ سے ہم ان کے تشخص کے بارے میں کچھ جان سکتے ہیں۔ مگر دوسرے فلم دیکھ کر ہمیں ایک ہی طریقے سے جوڑی ہوئی اور ایک ہی نگاہ سے دیکھی ہوئی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ان کے مشاہدے سے ہم صرف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پبلک کی مانگ پر پروڈیوسروں نے چند نااہل ڈائرکٹر پکڑ کر اپنے سیلولائڈ کے اوپر بے معنی نقش بنوا لئے ہیں، جن کو نہ وہ خود سمجھ سکے اور نہ پبلک ہی سمجھ سکی۔

ہندوستان میں روزانہ سینکڑوں فلموں کی نمائش ہوتی ہے، مگر نہایت تاسف ہے کہ ان میں سے بہت کم فلم، فلم ہوتے ہیں۔ دراصل جو ڈائرکٹر یہ فلم تیار کرتے ہیں، تخیل سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ وہ اسٹوری کو سامنے رکھ کر صرف کلوز اپ، مڈ شاٹ اور

لانگ شاٹ میں کیمرہ رکھنے کا حکم دینا جانتے ہیں۔ اور بس وہ کیمرے کو ہیروئن کے چہرے
کے قریب بار بار لے آتے ہیں۔ مگر ان کو کلوز اپ کی اہمیت قطعی طور پر معلوم نہیں ہوتی
ایسے ڈائرکٹر ان نام نہاد ادیبوں کے مترادف ہیں جو بے ربط عبارت لکھتے ہیں۔ اور
جنہیں الفاظ کی نشست و برخواست کا کوئی سلیقہ نہیں ہوتا۔ ارنسٹ کیوبش کا فلم اگر اس
کے نام کے بغیر پردے پر آئے تو آپ اس میں ٹھوس مزاح کے رنگ اور معمولی سے معمولی اشیاء
کے موزوں و مناسب استعمال کو دیکھ کر فوراً کہہ دیں گے، ارنسٹ کیوبش پردے پر چل
پھر رہا ہے۔ دلکش بیرونی مناظر اور پھولوں میں ہیروئن کو تیتری کی طرح پھڑ پھڑاتا دیکھ
کر آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ پردے کے پیچھے ڈی۔ ڈبلیو گرفتھ کا دل دھڑک رہا
ہے، جو نیچر کی سحر کاریوں کا دلدادہ ہے۔ اسی طرح ایرک فان سٹراہیم کی حقیقت پسندی
چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اس جواز میں اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہالی وڈ
کے قریب قریب ہر ڈائرکٹر کا ایک طرز یا اسٹائل ہے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔
مگر یہاں ہندوستان میں اہل طرز ڈائرکٹروں کا فقدان ہے۔ اس وقت صرف دو ڈائرکٹر
ایسے ہیں، جنہیں صاحب طرز کہا جا سکتا ہے۔ دیوکی بوس اور شانتا رام۔ دیوکی بوس
کی شائستگی ہی ایک ایسی چیز ہے، جو اسے دوسرے ڈائرکٹروں پر امتیاز بخشتی ہے۔
راج رانی میرا، پورن بھگت، آفٹر دی ارتھ کوئیک اور ودیاپتی میں آپ دیوکی بوس
سے خواب دیکھنے والے دیوکی بوس کو سیلولائڈ کے ہر انچ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس
کا اسٹائل اوریجنل ہے اور اسی وجہ سے وہ کامیاب رہا ہے۔

اشاریت اور عظمت پسندی۔ شانتارام کے اسٹائل کے دو بڑے جزو ہیں، جس
فلم میں بھی آپ یہ دو چیزیں پہلو بہ پہلو دیکھیں گے، آپ کا خیال فوراً پربھات فلم کمپنی

کے شانتارام کی طرف چلا جائے گا۔ وہ اپنے اسٹائل میں اور کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسے ہندوستان کے ڈائرکٹروں کی صفِ اوّل میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

نیتن بوس کے نام کا یہاں اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ اہلِ طرز ڈائرکٹر نہیں۔ وہ ایک نہایت اچھا "نمائش کار" ہے۔ اس کو اپنے خیالات اور افکار کی نمائش کرنے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح یاد ہے اور یہی اس کی قابلِ رشک کامیابی کا باعث ہے۔

ایکٹنگ

ایکٹنگ یا کردار نگاری اس فن کا نام ہے جس کے ذریعے سے مختلف انسانوں کے جذبات و محسوسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مصوری، سنگ تراشی شاعری افسانہ نویسی اور موسیقی کی طرح کردار نگاری کو بھی فنونِ لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ گو بعض منکر اس سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تمام لوگ جو روس کے مشہور معلّمِ اخلاق مصنّف ٹالسٹائی کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اسٹیج اور اسکرین کو آرٹ کی شاخ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہوں گے۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق ٹالسٹائی کا نظریہ قریب قریب ہر مفکّر کے نظریے سے جدا گانہ ہے۔ وہ غایت درجہ حقیقت پسند تھا اور چونکہ اسٹیج اور اسکرین پر حقیقت بہت کم نظر آتی ہے، اس لئے اس کے نظریے کے مطابق فلم اور اسٹیج پر کھیلے ہوئے ناٹک آرٹ سے بہت دور ہیں۔

اپنا اپنا خیال ہے ——— کردار نگاری کا فن افسانہ گوئی کی طرح ہبوطِ آدم سے چلا آرہا ہے۔ دوسرے کے دل پر بیتے ہوئے واقعات بیان کرنا اور کسی دوسرے قلب کی گہرائیوں کا اظہار کرنا کردار نگاری ہے۔ جب آپ کا چھوٹا بھائی یا کمسن بچہ

رات کو سوتے وقت آپ کو بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی دادی اماں چوہے سے ڈر کر غسل خانے میں چھپ گئیں۔ اور مارے خوف کے ان کا سارا جسم کانپنے لگا تو اس وقت دراصل وہ ایک ایکٹر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اگر اس بچے کی قوتِ بیان کمزور نہیں اور وہ آپ پر اپنی دادی اماں پر بیتے ہوئے واقعات کو اس طرح بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے سامنے ایک تصویر سی دیکھنے لگتے ہیں۔ اور آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعی آپ کی آنکھوں کے سامنے بچے کی دادی اماں فرطِ خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بچہ ایک کامیاب ایکٹر ہے اور اس کے اظہار میں تعدیہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

فلموں میں یہی چیز بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں آپ کے چھوٹے بھائی یا کمسن بچے نے صرف اپنے دل کی خواہش کی بنا پر اپنی دادی اماں کی کیفیت بیان کی تھی اور یہاں کئی بچے جوان بوڑھے عورتیں اور مرد جمع ہو کر ایک کہانی سن کر کسی کے کہنے پر آپ لوگوں کو سنا دیتے ہیں۔ یہ فرق بظاہر معمولی ہے مگر چونکہ آپ کو بہت سی اندرونی باتیں معلوم نہیں، اس لئے آپ نہیں جانتے کہ جب آپ کا بچہ یا بھائی اپنی دادی اماں کی داستان سنا رہا تھا تو اس کو اس امر کے لئے کسی اور شخص نے اکسایا نہیں تھا۔ یہ اکساہٹ خود بخود اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے برعکس فلم بنانے سے پہلے ہر ایکٹر کے ہاتھ میں اس کا پارٹ دے دیا جاتا ہے۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کو بطریقِ احسن نبھائے گا۔

ایک بات اور۔ بچہ جب اپنی کہانی سنا رہا تھا تو اس وقت اس کے پاس کوئی ہدایت دینے والا موجود نہیں تھا۔ لیکن جب ایکٹر کسی افسانوی کردار کے جذبات

کا چربہ اتارنے لگتے ہیں تو ان کے پاس ایک سے زیادہ ہدایت دینے والے موجود ہوتے ہیں۔ جو اپنے خیال کے مطابق ان سے کام لیتے ہیں۔ بچے نے جب کہانی سنائی تھی تو اس کی گفتگو اور اس کی جسمانی حرکات کے تسلسل میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر یہاں کیمرے کے زاویے تبدیل کئے جاتے ہیں۔ روشنی میں کمی یا زیادتی کی جاتی ہے۔ اور پھر ایکٹر کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اسے ایک خاص حد تک رہ کر اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ اسے جذبات نگاری کے دوران میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں۔

۱۔ اگر وہ مقررہ جگہ سے ایک انچ بھی ادھر سرک گیا تو کیمرے کی زد سے باہر ہو جائے گا۔

۲۔ اگر اس نے منہ ادھر کو موڑ لیا تو کیمرہ مین اس کے ایکٹنگ کی تصویر میں وہ بات پیدا نہ کر سکے گا، جو اس کے دماغ میں ہے۔

۳۔ اگر اس نے مدھم آواز میں مکالمے کی ادائیگی کی تو اس کی صدا بندی نہ ہو سکے گی۔

اسی قسم کی اور بہت سی مشکلات ایکٹر کے راستے میں حائل رہتی ہیں۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ فلموں کے لئے ایکٹنگ یا کردار نگاری بہت مشکل کام ہے۔ اور اس کے لئے ایک مخصوص ذہن اور جسم کی ضرورت ہے۔ ہالی وڈ میں جو صنعتِ فلمسازی کا باوا آدم ہے، کردار نگاری کے لئے بڑی چھان بین اور جستجو کے بعد ایسے آدمی تلاش کئے جاتے ہیں جو اپنے اندر ایک اعلیٰ کیریکٹر کی اہلیتیں اور خوبیاں پنہاں رکھتے ہوں۔ اسٹار بنانے کے لئے جو کاوش ہالی وڈ کے پروڈیوسر کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قریب قریب ہر کمپنی کے چند کارکن مختلف ممالک کی

سیاحت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح چل پھر کر وہ اپنے نگار خانوں کے لیے تازہ دم ایکٹر فراہم کرتے ہیں۔ پھر ان کی تعلیم پر بے اندازہ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور جب وہ پردے پر لائے جاتے ہیں تو ایک ہی رات میں ان کی شہرت اکناف عالم میں پھیل جاتی ہے۔

ہندوستان میں جب صنعتِ فلمسازی کا آغاز ہوا تو میراثی ربابی طبلچی اور سارنگئے بطور ایکٹر اور بھنگنیں اور طوائفیں بطور ایکٹرس بھرتی کی گئیں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اس معیار میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ جس مرد کی آواز اچھی ہو اور وہ بازاری قسم کے گانے سریلی آواز میں گا لیتا ہو، اسے کامیاب ایکٹر متصور کر لیا جاتا ہے اور اس کو اسٹار بنا کر سال میں چھ چھ فلم تیار کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح عورت میں صرف حسن کو ایکٹنگ کے فن کا بہترین مظہر قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

ہمارے ملک میں صنعت فلمسازی کی بنیاد چونکہ غلط اصولوں پر رکھی گئی ہے اس لئے ایکٹنگ کا فن قریب قریب مفقود ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے یہاں اچھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی کمی ہے۔ ہندوستان میں یقیناً ایسے افراد موجود ہیں جو موقع بہم پہنچانے پر اپنے آپ کو اس فن کے استاد ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسا کیا ہی نہیں جاتا۔

فلموں کا سادھو

اگر آپ فلموں کو غور سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، تو بھی آپ نے اپنے ملک کے فلموں میں ایک چیز ضرور نوٹ کی ہو گی۔ جو بار بار دکھائی دیتی ہے۔ میری مراد

اس فقیر یا سادھو سے ہے جسے ہمارے ڈائرکٹر کہیں نہ کہیں گوا یا کرتے ہیں۔ منظر نامے میں یہ لکھا ہے کہ ہیروئن اداس بیٹھی ہے اور ڈائرکٹر صاحب کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ اداس ہے، غمگین ہے۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ چونکہ کریکٹر کی ساری ذمہ داریاں ان کے سر پہ ہیں، اس لئے لازمی طور پر انہیں ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے، جس سے تماشائیوں پر یہ واضح ہو جائے کہ ہیروئن اداس بیٹھی ہے ——— اداس! ——— ڈائرکٹر صاحب سوچتے ہیں، اپنے تخیل کی کتاب کے سارے ورق پلٹتے ہیں۔ اور اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، نہایت ہی اچھوتا خیال۔ وہ سوچتے ہیں "کیوں نہ باہر سے یا ساتھ والے باغ میں سے کوئی سادھو پُر درد گیت جمٹے پر گاتا ہوا گزرے۔ سادھو فلاں فلم میں آچکا ہے، مگر کیا ہوا .... یہ سادھو نہ ہوگا، کوئی بھیک مانگنے والا ہوگا۔ اور کیا بھکاری گا کر بھیک نہیں مانگتے۔ ان کے گیت بھی تو اکثر اوقات دردناک ہوتے ہیں، اور کیا ان کے چہرے اداس نہیں ہوتے؟ .... یہ حقیقت پر مبنی ہوگا .... یہ سچ!"

ڈائرکٹر صاحب نے اپنا سر ہلا کر چٹکی بجائی اور ایک بھک منگا گیت سمیت تیار ہوگیا۔ اسٹوڈیو میں ایک آدھ گویا عام طور پر اسٹاک میں ضرور ہوتا ہے، جسے جہاں چاہیں گوا دیا جاتا ہے۔ اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں گاتا ہے اور کس لئے گاتا ہے۔ وہ گانے کی ایک مشین ہے، جس کو صرف چابی کی ضرورت ہے اور یہ چابی ہمارے ڈائرکٹر صاحب کے پاس محفوظ ہوتی ہے۔

میں ایک ایسے گویے کو جانتا ہوں جو اسٹوڈیو کے ہر درخت کے نیچے بیٹھ کر

ایک نہیں درجنوں گیت گا چکا ہے، سمندر کے پاس، دریا کے کنارے، گاڑی میں پیدل اور چل پھر کر اس بیچارے نے خدا معلوم کتنے گیت گائے ہیں۔ کبھی اس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی، دو بالشت لمبی، کبھی اس کے سر پر جٹیں تھیں، یہ بڑی بڑی، کبھی اس کے ہاتھ میں کشکول تھا اور کبھی چمٹا۔ کبھی اس کے بدن پر راکھ تھی اور کبھی پھٹے پرانے چیتھڑے۔

اس قسم کے ایک سکہ بند گویّے کو ڈائرکٹر صاحب نے میک اپ ایکسپرٹ کے حوالے کیا۔ جس نے اس کے بدن پر سالہا سال کے پرانے اور بدبودار چیتھڑے چپکا دیئے چہرے پر میک اپ کا روغن مل کر بڑھاپا پیدا کرنے کی خاطر چند ٹیڑھی بنگی لکیریں کھینچ دیں، اور اسے آئینہ دکھلا کر سیٹ پر بھیج دیا۔ گیت کی ریہرسل ہوئی۔ ستار کے تار کی آواز بلند ہوئی اور ہمارے اس گویّے کو کیمرے نے نگل لیا۔ اور جب یہ دھکڑ نے اس کو پردے پر اگلا تو ہم نے دیکھا کہ ہیروئن صوفے پر بیٹھی ہے ۔۔۔ لانگ شاٹ کے بعد اس کا یہ بڑا کلوز اپ آیا۔ ہیروئن نے اپنی آنکھوں سے گوہر کی طرح کے ڈھائی آنسو بہائے۔ دفعتاً طبلے کی تھاپ سنائی دی اور کسی کے گلنے کی "درد بھری آواز" بلند ہوئی۔

"دل ناصبور اداس ہے ۔۔۔

مجھے تیرے درس کی پیاس ہے

دل ناصبور ۔۔۔ اداس ہے"

ہیروئن نے دو آنسو اور۔ بڑی مشکل سے اگلائے۔ رکٹ ہوا اور ہمیں ایک بازار میں وہی مصیبت کا مارا گویّا بھکاری کے لباس میں راستہ ٹٹولتا اور گاتا دکھائی دیا۔

یہ گیت ساڑھے سات منٹ تک جاری رہا۔ اس دوران میں کبھی ہم نے ہیروئن کو آہیں بھرنے کی ناکام کوشش کرتے دیکھا اور کبھی اس بھکاری کو کن سری تانیں نکالتے ہوئے۔ جب گیت ختم ہوا تو ہیروئن کا باپ، جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا، اندر آیا اور کہنے لگا۔ "بیٹا تجھے کیا دکھ ہے؟"

میں پوچھتا ہوں آخر یہ کیا حماقت ہے؟ کیا ہم جب اداس ہوتے ہیں تو ہماری اداسی کی خبر شہر کے بھکاری دوسرے دن تک پہنچایا کرتے ہیں؟ ایک دو مرتبہ ایسا ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ہم چھ سات ڈائرکٹروں کو اسی قسم کا "خون" معاف کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ذوق کی رگیں یقیناً ایسے جھٹکوں کو مسلسل برداشت نہیں کر سکتیں۔ فلموں میں گویئے سادھو اور بھکاری دیکھ دیکھ کر ہم بیزار ہو گئے ہیں۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ آج سے چار یا پانچ سال قبل جب میں ہندوستانی فلم دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ مجھے سادھوؤں اور بھکاریوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ جب کبھی کسی سادھو یا بھکاری کو سڑک پر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے فلموں کا گویا سادھو یاد آ جاتا ہے اور مجھے نفرت سے منہ پھیر لینا پڑتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ہمارے فلموں میں اس سادھو مہاراج کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ڈائرکٹروں کے ذہن اتنے عقیم ہیں کہ وہ کوئی دوسرا راستہ کوئی نیا اسلوب پیدا نہیں کر سکتے۔ فلم میں جہاں کہیں ان کے دماغ تصویروں کے ذریعے سے افسانہ سنانے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ اس سادھو کو بلا کر گویئے

ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہی پتھر سے دو شکار کر لئے ہیں ــــ ایک گیت بھی پیش ہو گیا۔ اور افسانے کا ایک پہلو بھی واضح ہو گیا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سنیمائی اصول کے پیشِ نظر یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اس لئے کہ تماشائیوں کی توجہ افسانے کے تسلسل سے ہٹ کر اس سادھو کی طرف چلی جاتی ہے، جس کا افسانے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ چند منٹوں کے لئے پردے پر آتا ہے اور گا کر چلا جاتا ہے اور افسانہ ایک جگہ کھڑا ہو کر رہ جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہاں کسی ایسے فلم نے ضرور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے جس میں اس قسم کا ایک سادھو گایا ہے اور ہمارے پروڈیوسروں نے فلموں کی مقبولیت اور کامیابی کا راز یہ سمجھ لیا ہے کہ ان میں سادھو اپنے گیت سمیت ضرور ہونا چاہئے، کتنی بڑی حماقت ہے۔ ممکن ہے کہ اس سادھو نے بڑا اچھا گایا ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ اس فلم کی کامیابی کا سارا دار و مدار اسی پر اور اس کے گیت پر ہو۔ اس کے دوسرے محاسن چھوڑ کر صرف ایک اچھی چیز لے لینا جو صرف تھوڑی سی اچھی دکھائی دے سکتی تھی، ہمارے ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کے دماغی افلاس کا مظہر ہے۔

کم ذوق پروڈیوسروں کو تو برطرف رکھئے۔ ہمارے یہاں کے اچھے اچھے باسلیقہ فلم ساز بھی اپنے فلموں میں اس سادھو کو پیش کر رہے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سادھو کی آہستہ آہستہ باکس آفس قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کی اہمیت ان لوگوں نے اور بھی زیادہ کر دی ہے حالانکہ اگر یہ غور کیا جائے تو ان کی یہ بدعت جو سارے فلموں پر ایک بدنما دھبے کی صورت

اختیار کر گئی ہے، دور ہو سکتی ہے۔ یہ سادھو ان لوگوں ہی کی تخلیق ہے اور یہی لوگ اسے کفنا کر کسی گہری قبر میں دفن کر سکتے ہیں۔

وہ لوگ جو ذوقِ صحیح کے مالک ہیں، ان سادھوؤں سے تنگ آ گئے ہیں۔ گذشتہ برس ہمارے پروڈیوسر درجنوں کے حساب سے ایسے سادھو پردے پر پیش کر چکے ہیں۔

آئندہ جو فلم پیش کئے جائیں، ان سے پاک ہوں۔

فلموں کے وِلن

ہمارے فلموں پر پرانے امریکی فلموں کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ اب بھی جب کہ ہندوستانی صنعتِ فلم سازی اپنا جشنِ سیمیں منانے والی ہے، ہم ان میں وہ چیزیں جو اب یعنی جدید خیالات و رجحانات کے اس دَور میں عجیب و غریب اور نامانوس معلوم ہوتی ہیں، دیکھتے ہیں۔ صنعتِ فلم سازی کے آغاز میں جو خطوط یورپ میں اختیار کئے گئے تھے، ہم آج بھی انہیں ہندوستانی سیلولائڈ پر دیکھ رہے ہیں، جس سے ہماری طبیعتوں کے جمود کا پتہ چل سکتا ہے۔ اب تک جس قدر فلم ہمارے یہاں تیار ہوئے ہیں، ان میں اکثر ایسے ہیں جو کولہو کے بیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب کا محور ایک ہی ہے۔ راقم الحروف کو بیشتر اوقات ایسے کئی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ اگر ان کے کیریکٹروں کے نام بدل دیئے جائیں تو ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ایک ہی افسانہ، ایک ہی مطلب اور ایک ہی تکنیک۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو تین شخص ایک ہی قطار میں کھڑے ہو کر ایک کہانی بیان کر رہے ہیں۔ یہ یکسانیت، یہ یک آہنگی بالخصوص جدت پسند طبیعتوں پر ایک نہایت ہی ناگوار بوجھ ڈالتی ہے،

جس کو دور کرنا ازبس لازم ہے۔

شروع شروع میں فلمی افسانے تین اہم کرداروں پر استوار کئے جاتے تھے ہیرو ہیروئن اور ولن۔ یہ بدعت ابھی تک جاری ہے۔ پردے پر ابھی تک یہ تثلیث چپکی ہوئی ہے۔ ہوشمند سے ہوشمند پروڈیوسر فلم بنانے پر ہیرو کے ساتھ ہیروئن اور پھر ان کے جلو میں ولن ضرور ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیرینی کے ساتھ تلخی بھی ہونی چاہئے اور روشنی کے ساتھ سائے بھی دکھانے چاہئیں۔ پر اس کا سلیقہ ہونا چاہئے۔

میں ہیرو ہیروئن اور ولن کے وجود پر معترض نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانے کے اہم جزئیات ہیں۔ پر مجھے ایسے ہیرو ایسے ولن اور ایسی ہیروئن دیکھنے سے سخت نفرت ہے، جن کے ماتھوں پر پہلے ہی سے لیبل لگا دیئے گئے ہوں اور ان کو علیحدہ علیحدہ کرکے بتا دیا گیا ہو۔ میں ادب اور فلم کو ایک ایسا مے خانہ سمجھتا ہوں جس کی بوتلوں پر کوئی لیبل نہیں ہوتا۔ جو لطف انکشاف اور دریافت میں ہے دوسروں کے فوراً بتا دینے میں نہیں ہے۔ میں ساری بوتلوں میں سے ایک ایک گھونٹ پی کر خود فیصلہ کرنے کا اختیار چاہتا ہوں کہ ان میں سے کون سی دوآتشہ ہے، اور کون سی سہ آتشہ ہے۔ اگر مجھ سے یہ اختیار چھین لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے مذاق کے تمام دروازوں پر تالے جڑ دیئے گئے ہیں، جن کی کنجیاں میرے پاس نہیں ہیں۔

پھر میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارے سب افسانوں کا ہیرو ایک ہی قسم کا ہو، خوبصورت شکیل نوجوان بہادر رحم دل وغیرہ وغیرہ، جو شروع سے لے

کے آخر تک لڑتا رہے۔ اس کی تلوار میں ایسی طاقت ہو کہ بڑے بڑے جغادریوں کے گلے کاٹ کر رکھ دے۔ پر دوسروں کی تلواریں اس کے گلے پر چل ہی نہ سکیں۔ اس کا پریم اس کی محبت سچی ہو۔ اور بے چارے وِلن کا عشق بالکل جھوٹا ہو۔ ایسے ہیرو میرے قیاس سے بہت بالاتر ہیں۔ میں پردے پر جب اس قسم کے لوگ دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بہت بڑی گپ سن رہا ہوں۔ میری طبیعت ایسی حقیقت سے بعید چیز دل کو قبول ہی نہیں کرتی۔

میری نظروں میں ہیرو وہی ہے، جسے میرا دل قبول کرلے۔ جس کے لئے میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں ہمدردی پیدا ہو۔ جس کے دل کی دھڑکنیں ایک بار میرے دل کی دھڑکنوں میں گھل مل جائیں۔ میرا ہیرو وہ ہے جو انسان ہو۔ انسانیت کا صحیح نمونہ برائیوں اور اچھائیوں سمیت۔ میرا ہیرو فرشتہ نہیں ہے، اس لئے کہ میں زمین پر رہتا ہوں۔ میرا طائرِ فکر آسمان کی انتہائی بلندیوں پر پرواز کرے گا۔ لیکن تمام وقت اس کی نگاہیں اپنے آشیانے پر جمی رہیں گی، جو مٹی کی گود میں ہے وہ ستاروں کی تابانی کی طرف بڑھے گا۔ مگر صرف اس لئے کہ وہ ان کو نوچ کر زمین کے ننگے سینے میں جڑ دے۔ مجھے بے کاخ وکو دنیا کے فرشتوں سے نفرت نہیں ہے، مگر مجھے اپنے بھائی انسانوں سے زیادہ محبت ہے، جو اس رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں۔

اپنے یہاں کے فلموں میں نیکوکار اور فرشتہ سیرت ہیروؤں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بعض اوقات سخت تعجب ہوتا ہے اور میں ان کو ایک ایسی دنیا کے باشندے سمجھنے لگتا ہوں، جو میری حدِ نظر سے بہت دور ہے۔ اور جب میں ان کے ساتھ

ساتھ ولن دیکھتا ہوں تو میرا تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ مخلوق بھی مجھے اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی۔

ہمارے فلمی افسانوں میں جس قدر کیرکٹر بھی پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ صرف ایک افسانہ بنانے کی خاطر مٹی کی ان پتلیوں کو جو چاہے شکل دے دی جاتی ہے۔ اور ہیرو ہیروئن اور ولن کے مختلف لیبل لگا دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات عورت کو اس طور پر پینٹ کیا جاتا ہے کہ وہ آسمانی حور معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کی تصویر کو اس قدر تاریک بنا دیا جاتا ہے کہ وہ چڑیل اور ڈائن معلوم ہوتی ہے۔ عورت جیسی کہ وہ ہے بہت کم افسانہ نگاروں کے تخیل میں ہے۔ اس کی وجہ اس حقیقت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے یہاں عورت اور مرد کے درمیان ایک نہ ٹلنے والا موٹا پردہ حائل ہے۔ ہمارے افسانوی ادب میں جن عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اسی فی صدی ایسی ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ ان میں اور اصل عورتوں میں وہی فرق ہے جو ٹکسالی روپے اور جعلی روپے میں ہوتا ہے۔ دونوں کا وزن برابر ہو سکتا ہے۔ بادی النظر میں دونوں ایک جیسے ایک شکل کے معلوم ہوتے ہیں، پر وہ کھنکھناہٹ جو ٹکسالی روپے میں ہوتی ہے، اس روپے میں نہیں ہوتی۔ ہمارے ان افسانوں کی یہ عورتیں عورتیں ہوتی ہیں، مگر ان میں وہ عورت پن نہیں ہوتا جو عورت کو صحیح عورت بناتا ہے۔

افسانوں میں بے شمار سیاہ کار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس دنیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے لوگ موجود ہیں جو بے رحم قصائیوں سے کہیں زیادہ بے رحم

اور ظالم ہیں۔ پست سے پست ذہنیت کے لوگ موجود ہیں۔ اس دنیا میں گناہ گاروں کی بھی کمی نہیں۔ پر جو گناہ گار، جو سیاہ کار، جو ظالم ہم پردے پر ولن کی شکل میں دیکھتے ہیں، کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یہ لوگ مجھے ایسے اذہان کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں جو گناہ اور ثواب، سزا اور جزا، ظلم اور رحم میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ ایک اور بات جو ان اذہان کی مخلوق دیکھ کر میرے ذہن میں آتی ہے، یہ ہے کہ جب وہ ایسے کردار تخلیق کرنے لگتے ہیں تو ان پر ایک قسم کا رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ وہ خوف کھانے لگتے ہیں۔ اگر انہیں اپنے کردار سے کوئی گناہ کرانا ہو تو وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ گویا وہ خود کوئی گناہ کر رہے ہیں۔

یہ جھجک یہ کرنے اور نہ کرنے کی درمیانی چیز جب ہم پردے پر دیکھتے ہیں، تو افسانہ نگار صاحب کا ولن ہمیں ایک نامکمل سا کھلونا نظر آتا ہے۔ پردے پر کرداروں کی بھاگ دوڑ کے علاوہ ہم افسانہ نگار کا ذہن بھی دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب متذکرہ صدر قسم کے کیریکٹر ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں، تو ہمیں ان کے بنانے والے کا دماغ بھی ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ جو ایک ایسی کل ایک ایسی مشین معلوم ہوتا ہے جس کے پرزے صرف پرانی رسموں، پرانے عقیدوں اور کہنہ اخلاقیات کے گاڑھے تیل کے بغیر چلتے ہی نہیں۔ یہ تیل جس کو لہو میں پیدا کیا گیا تھا، اب اس کا وجود بھی باقی نہیں۔ کیا اب نئی چکناہٹ تلاش نہ کرنا چاہئے۔

ہمارے افسانہ نگاروں کی سب سے مضحکہ خیز تخلیق ولن ہے۔ جس کی ساری عمر گناہ میں بسر کرائی جاتی ہے۔ اور آخر میں اسے نیکی کے سمندر میں غوطہ دے دیا جاتا ہے تاکہ ہمارے فاضل افسانہ نگار کا اخلاقی پہلو تنقید سے بچا رہے۔ ان کے پیش نظر

اپنے کردار کے تشخص کے بجائے اپنا تشخص ہوتا ہے۔ اگر ان کا کوئی کیریکٹر برا کام کرے تو وہ سمجھتے ہیں کہ خود ان سے کوئی بری حرکت سرزد ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہم ان کے افسانوں سے محسوس کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اسے چھپانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اسی طرح اگر ان کے کسی کیریکٹر سے کوئی اچھا کام ہو جائے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خود انہوں نے کوئی اچھا کام کیا ہے۔ چنانچہ ان کی مسرت ہمیں ان کے کیریکٹر کے چہرے پر نظر آسکتی ہے۔ اس قسم کا بچپن، اس قسم کی سستی جذباتی کیفیت اعلیٰ درجے کے ادب میں نہیں آنا چاہیے۔

افسانے کی بساط شطرنج کی بساط نہیں، جس پر صرف مقررہ مہرے چلتے ہیں افسانے کی بساط اس وسیع دنیا کی بساط ہے، جس پر ان گنت مُہرے چل رہے ہیں۔ افسانے، ہیرو، سائڈ ہیرو، ہیروئن، سائڈ ہیروئن، ولن، سائڈ ولن، ویمپ، اور سائڈ ویمپ کے بغیر بھی —— افسانے ہو سکتے ہیں۔ پر ذرا سمجھ کی ضرورت ہے۔

زندگی

(اسی نام کے ایک فلم پر ریویو)

بلّوری چوڑیوں نے کھنکھناہٹ سے پوچھا "میں خوبصورت ہوں کہ تو؟"
عُود کا دھواں آگ کے بستر سے پریشان ہو کر اٹھا۔
ہوا ایں سانپ کی طرح اس نے بل کھا کر کہا "تو میرے سینے کا راز ہے یا میں؟"
فرشتے آسمان کی ہلکی پھلکی فضاؤں میں پر تول کر رہ گئے۔
ابرِ بہار نے خزاں کی مٹھی کھولی اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔
طلوعِ آفتاب کی آڑی ترچھی کرنوں کے شور سے اندھیارا گھبرا کے اٹھا اور بھاگ گیا۔

●

گاگر نے چھلکتے ہوئے پانی سے کہا "تو اتنا بے صبر کیوں ہے؟"
گھونگھٹ کے نیچے ایک کنوارے چہرے پر نہ معلوم کتنے رنگ آئے اور چلے گئے۔
سوسن کے پھولوں میں شہد کی بھوری مکھیاں پڑی اونگھتی رہیں۔

آس شبنم کی بوندوں کی مانند اس کے دل پر ٹپک رہی تھی۔
دروازے نے ہولے سے آہ بھری اور دہلیز کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر ایک کپکپی منجمد ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ نثر کی شاعری کا ایک نہایت ہی لطیف نمونہ ہے۔ چند سطروں میں زندگی کا تمام رس نچوڑ کر بھر دیا گیا ہے۔ پہلی سطور میں تصوف کا رنگ ہے۔ بلّوری چوڑیوں کا اپنی کھنکھناہٹ سے پوچھنا "میں خوبصورت ہوں کہ تو" کتنا اچھوتا خیال ہے اور تصوف کے چہرے پر سے یہ نقاب کو کس دلکش انداز سے اٹھاتا ہے۔ شاعر کا سینہ قدرت کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ وہ فرشتوں تک پہنچتا ہے۔ مگر فوراً ہی زمین پر ابر بہار اور بلند درختوں کی سرگوشیاں سننے کے لئے دوڑ آتا ہے۔

نیچریت کا ایسا اچھا نمونہ ہندوستانی شاعری میں ملنا محال ہے۔ اوزان کی قید سے آزاد یہ منثور نظم دیہاتوں میں چلنے والی ہوا کے مانند ہلکی پھلکی اور معطر ہے۔ اس میں زندگی ہے۔ اور اس زندگی کے اندر حرکت ہے۔ ایک لطیف حرکت، ایک پیارا ارتعاش ہے۔ ایسا ارتعاش جو کنواری لڑکیوں کے جسم پر طاری ہوا کرتا ہے۔

الفاظ کی نشست برخواست بہت اچھی ہے۔ موزونیت بھی نہایت عمدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم منثور کے مصنف نے دلہن کی ساڑھی میں تارے بڑی احتیاط سے ٹانکے ہیں۔ ہر ایک نقطہ چمکتا ہے لیکن یہ چمک خیرہ کن نہیں آنکھوں کو کھٹکتی نہیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔

اس نظم پر اسی طرح اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہر ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم منثور محض دماغی عیاشی ہے۔ لکھتے وقت اس کے مصنّف کے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ لفظ خوبصورت ہوں اور ان کی ترتیب بھی سندر ہو۔ مگر مطلب کچھ نہ ہو۔ چنانچہ یہ نظم پڑھنے کے بعد مزا تو آجائے گا مگر مطلب ہرگز ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ اس غرض سے لکھّی ہی نہیں گئی۔

یہ نظم ہی نے لکھی ہے اور اس پر میں نے صرف دو منٹ صرف کئے ہیں۔ ہندوستانی ادب میں اب ایسی نظموں کا فیشن عام ہو گیا ہے۔ یورپ کا لٹریچر چونکہ بہت وزنی ہو چکا تھا، اس لئے لوگوں نے اس قسم کی ہلکی پھلکی منثور شاعری کی طرف توجہ دی۔ اور یورپ کا قاری جو کہ بوجھل افکار سے تنگ آچکا تھا، ایسی نظموں کا دلدادہ ہو گیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی لٹریچر میں یہ "ادبِ لطیف" داخل ہو گیا۔ ہندوستان چونکہ تقلید کا شروع سے عادی ہے اس لئے اس کے ادب نے اس نئی قسم کی شاعری کو قبول کر لیا۔ چنانچہ آج ہم پردۂ سیمیں پر نیو تھیٹرز کا فلم زندگی دیکھتے ہیں۔ جو اس قسم کے ادب لطیف کا ایک ٹکڑا ہے۔

میں نے یہ فلم دیکھا اور جب ہال سے باہر آیا تو میں سوچ رہا تھا کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ ہندوستان کے جلیل القدر مکالمہ نویس پنڈت اندرا کے قول کے مطابق اس فلم میں سائیکولوجی تھی۔ یعنی کوئی ایسی چیز جو فہم سے بالاتر ہو ایک نہایت ہی لطیف شے جو کہ ایتھر میں تیرتی ہو۔

خواجہ عباس صاحب اور جمیل انصاری صاحب کہتے ہیں زندگی بہت اچھا فلم ہے۔ اس لئے میں بھی کہتا ہوں یہ فلم بہت اچھا ہے۔ مگر میں "زندگی" دیکھنے گیا

تھا۔ زندگی۔ میرا خیال ہے جمیل انصاری صاحب اس کا مطلب بخوبی سمجھتے ہوں گے ہال میں جب اندھیرا ہوا اور زندگی شروع ہوئی تو مجھے اس کی رفتار دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ شراب خانے میں ویٹر نے تیز و تند شراب کے بجائے غلطی سے میرے ہاتھ میں سکنجبین کا گلاس تھما دیا ہے سا ب میں نہ اسے واپس کر سکتا ہوں اور نہ پھینک سکتا ہوں۔ چونکہ یہ ہماری زندگی کے ادب کے منافی ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک میں اس کھٹے میٹھے شربت کو آہستہ آہستہ پیتا رہا۔ کھٹ میٹھا شربت اگر اس میں کافی برف ڈالی گئی ہو، بدذائقہ نہیں ہوتا۔

زندگی اچھا فلم ہے۔ اس لئے کہ اس میں زندگی کے سوا سب کچھ تھا۔ اس میں کھوٹی دونی تھی۔ جو صرف برنا ہی چلا سکتا ہے۔ اس میں گیت تھے، جو صرف سہگل ہی گا سکتا ہے۔ اس میں مکالمے تھے جو صرف جمنا ہی ادا کر سکتی ہے۔ اس میں مدہوشی تھی جو پہاڑی کی ہوشمندی پر غالب نہ آ سکی۔ اس میں فلسفہ تھا جو جمیل انصاری صاحب نے سمجھ لیا ہے۔ اور اس میں موم بتی بجھنے کا ٹچ تھا جو فنی نقطۂ نگاہ سے بہت ہی بلند ہے اور جسے خواجہ عباس صاحب نے بھی بہت پسند کیا۔ اور ان سب کے اوپر اس میں ٹیلی پیتھی ہے جو میاں کاردار صاحب کو بہت پسند ہے اور جو فلم میں باکس آفس ویلیو پیدا کرتی ہے!

زندگی اچھا فلم ہے اس لئے کہ اسے ڈائرکٹر بروا نے تیار کیا ہے۔ اور نیو تھیٹرز نے پیش کیا ہے۔ اس میں سہگل اور جمنا ہیں۔

پشاور سے بمبئی تک کئی ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ ان میں کچھ تیز رفتار ہیں۔ اور کچھ سست رفتار۔ اگر آپ بمبئی سے پشاور پہنچنا چاہتے ہیں، خواہ دس پندرہ دن

صرف ہو جائیں۔ تو آپ کو "زندگی" بہت پسند آئے گی۔ یہ ایک ایسا ٹھہرا ہوا پانی ہے جس میں کبھی کبھی درخت کا کوئی پتہ گرنے سے بھنور پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سڑک ہے جس میں کوئی موڑ نہیں آتا۔ جو کہ سیدھی چلی گئی ہے۔ موت کے دھانے تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "زندگی" کا مصنف اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنی کھینچی ہوئی سیدھی لکیر پہ ہولے ہولے چل رہا ہے۔ اور آخر میں دھڑام ایک گہری کھائی میں گر پڑتا ہے۔

زندگی —— زندگی کی شکایت ہے موت سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی گھٹنے ٹیک کر موت کے دامن سے آنسو پونچھ رہی ہے۔ "زندگی" —— ایک ایسی زندگی ہے جو کبھی زندگی تھی۔ ایسے انسانوں کو جو مکسیم گورکی کے لفظوں میں کبھی انسان تھے۔ یہ فلم زندگی کی ارتھی ہے جو ہم بروا کے ناتواں کاندھوں پر دیکھتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مردہ چیز کا وزن بہت زیادہ ہو جایا کرتا ہے۔ فلم کے کئی حصّوں میں آپ محسوس کریں گے کہ بروا اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہے۔ اس کا دم پھول گیا ہے اور سستانے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا ہے۔

مجھے حرکت سے پیار ہے۔ ہر تیز رَو چیز کو دیکھ کر میرے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوڑتی ہوئی موٹریں، دندناتی ہوئی ریل گاڑیاں، تیزی سے گھومتے ہوئے پنگوڑے، یہ سب مجھے پیارے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری نبضِ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں کوئی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ میری زندگی کے گھوڑے کو ایڑھ نہیں لگی۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ہاں

میں جیسا گیا تھا، ویسے کا ویسا باہر آگیا۔ میں زندگی دیکھنے گیا تھا، مجھے موت نظر آئی۔ میں مانتا ہوں کہ زندگی کا انجام موت ہے۔ لیکن موت میں بھی تو زندگی ہے۔ موت مُردہ تو نہیں ہوتی۔ وہ موت جو زندگی کو اپنے کھُردرے ہاتھوں میں مسل دیتی ہے۔ جو رگِ حیات کو دبا کر اس کا پھڑکنا بند کر دیتی ہے، کیسے بے جان ہو سکتی ہے۔ میرے خیال کے مطابق موت زندگی سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ زندگی سے کہیں زیادہ زندگی سے بھرپور ہے۔ مگر جو موت مجھے زندگی میں نظر آئی، بے جان تھی۔ زرد بالکل زرد ــــ

فلم کا افسانہ ایک بیکار گریجویٹ نوجوان اور ایک ستم رسیدہ عورت (جس کا شوہر شرابی اور بدکار ہے) کے کرداروں پر استوار کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے ایک دلدل پر عمارت کھڑی کی ہے، جو ہر اینٹ کے دباؤ سے نیچے دبی جاتی ہے۔ افسانے کی ہیروئن دکھی ہے۔ اس لئے کہ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کر دی گئی ہے جو شرابی ہے۔ وہ اپنی استری کے حقوق کو پامال کرتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ اپنی دھرم پتنی کو مارتا ہے۔ اس کو ٹھکرا کر گھر سے نکال دیتا ہے شریمتی ہیروئن گھر سے باہر نکل آتی ہے۔ یہ افسانے کی معراج قرار دی گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شریمتی ہیروئن نے کون سا بہادری کا کام کیا۔ جس عورت کی زندگی اجیرن تھی (جس کو دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ اس نے اپنے پتی کا گھر بار چھوڑنے کی بہادری کیسے کی؟ وہ تو ایک بےکار شے سمجھ کر باہر پھینک دی گئی تھی۔ خود باہر نکلنے کی اس نے ہمت نہیں کی۔

اور پھر جب وہ پتی کا گھر چھوڑ کر باہر نکلتی ہے اور رتن لعل آوارہ گرد سے

ملتی ہے تو وہ چھپی کیوں بیٹھی تھی؟ اور رتن لعل کیوں تینہ کھڑکنے پر بھڑک اٹھتا تھا رتن لعل بیکار کیوں تھا؟ ۔۔۔ میں نے اس کے حلق سے اتنے سُریلے گانے سنے ہیں ۔ وہ ان کی بدولت کما سکتا تھا۔ اگر "زندگی" اس زمانے کی کہانی ہے تو وہ نیو تھیئٹرز ہی میں بڑی آسانی کے ساتھ نوکری حاصل کر سکتا تھا۔ اچھے گانے والوں کی ہر فلم کمپنی کو ضرورت ہے۔ پھر وہ بے کار کیوں رہا۔ سارا فلم دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار رہنا چاہتا تھا یا اسے زبردستی افسانہ نگار نے بے کار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کینوس افسانہ نگار نے بہت ہی محدود کر دیا ہے۔ زندگی ایک تنگنائے نہیں، چوڑا سمندر ہے، جس میں بڑے بڑے جہاز بھی چلتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی۔ مگر اس فلم میں تو رتن لعل اور شرمیتی ہیرو ئن اپنی کشتیوں کو اُلٹ کر اس کے پیندوں میں سوراخ بناتے رہے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں "زندگی" رتن لعل اور شرمیتی کی ایک شکایت ہے سماج سے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے نہ مل سکے۔ انہیں ایک دوسرے کا وصل نصیب نہ ہو سکا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ وصل ہی زندگی کا واحد نصب العین ہے۔ کیا جنسی عشق ہی زندگی کا محور ہے۔ کیا اسی محور کے ارد گرد زندگی گھومتی ہے؟

شرمیتی ہیروئن شادی شدہ ہے۔ چونکہ ہندو مذہب میں طلاق نہیں ہے اس لئے وہ اپنے بے کار عاشق سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور بے کار باکار اس لئے نہیں بن سکتا کہ وہ شرمیتی ہیروئن سے شادی نہیں کر سکتا۔ بس یہ زندگی کا پلاٹ ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ محبت بہت طاقتور ہے۔ وہ بیکاروں کو نوکری بھی دلوا

سکتی ہے۔ وہ ان کے سینے میں زندہ رہنے اور کچھ کر گزرنے کی اکساہٹ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریمتی ہیروتن اور شریان ہیرو کی محبت کون سی نوعیت کی تھی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کا پریم محض جنسی تھا اور سچ پوچھئے تو فی زمانہ مرد اور عورت کا پریم ہوتا ہی جنسی ہے۔ اگر ان دونوں کا پریم جنسی دائرے سے باہر ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ رتن لعل کچھ کرتا۔ گانے کے علاوہ وہ تنازع للبقا میں حصہ لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا۔ اس لئے کہ محبت فالج کی قسم کی بیماری نہیں ہو سکتی۔

اور پھر شریمتی ہیروتن نے کیا کیا۔ وہ پڑھی لکھی ہوشمند عورت تھی۔ اپنے دل کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اپنی مشکلات سے واقف تھی۔ اس میں اتنی جرأت بھی تھی کہ اپنے باپ کے گھر جانے کے بجائے ایک نامحرم مرد کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رات بسر کرے۔ بازاروں اور گلیوں میں اس کے ساتھ گھومتی پھرے۔ وہ اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتی تھی جیسا کہ اس کی خواہش تھی۔ نوکری تلاش کر سکتی تھی اور اگر وہ جرأت کرتی تو اپنے عاشق کو اپنا بھی سکتی تھی۔ لیکن اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ وہ ڈرتی رہی۔ کیوں؟ اس کا جواب بروا صاحب نے آخر میں دیا ہے۔ جب کہ شریان رتن لعل کرداری انداز میں سماج کو گالیاں دیتا ہے۔

سماج کو گالیاں ضرور دی جائیں۔ اگر ہو سکے تو اس کو پھٹے ہوئے جوتوں کا ہار بھی پہنا دیا جائے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ سماج ہے کیا؟—

کیا شریمتی ہیروتن اور شریان ہیرو اس سماج ہی کا ایک حصہ نہیں۔

سماج کو اگر ایک اڑیل خچر سمجھ لیا جائے تو افسانے کا ہیرو رتن لعل اس کی دُم ہے جو مکھیاں ہٹانے کی کوشش میں ہلتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں "زندگی" ایک بہت بڑا سماجی ظلم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ اس میں ایک بار سماج کا ذکر آیا ہے۔ اور سماج کے اس قانون کو بھی توڑنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شادی شدہ عورت جس کی شادی غلط مرد سے کر دی گئی ہو، کسی دوسرے مرد سے رومان لڑا سکتی ہے۔ میں اس کے حق میں ہوں مگر میں ایک باقاعدہ جنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی چیز توڑ دی جائے، یا اس کے توڑنے کی تمنا دل میں پیدا ہو تو میں آنکھوں میں آنسو اور حلق میں آہیں دیکھنے کا قائل نہیں۔ ہتھوڑا لیا جائے اور بڑھ کر اسے توڑ دیا جائے۔ چلو چھٹی ہوئی۔

شریمتی ہیروئن، تو جب چاہے، اس قانون کو توڑ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اُس کے پاس دولت کا وزنی ہتھوڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس موقع کی تلاش میں تھی۔ لیکن یہاں ایک بات اور کہنا پڑتی ہے کہ زندگی میں مواقع پیدا کئے جاتے ہیں، خود بخود پیدا نہیں ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ میں "زندگی" کو زندگی بخش نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں یہ فلم ایک جنسی تھکان ہے جو بروا یا افسانہ نگار پر طاری ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ اس قسم کی تھکاوٹ طاری ہونا ہی زندگی ہے؟ اس کا جواب شاید جمیل انصاری صاحب دے سکیں۔ ایک بات اور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ شریمتی ہیروئن گھر سے باہر نکال دیئے جانے پر اپنے باپ کے گھر جانے کے بجائے شریمان ہیرو کے ساتھ چپک جاتی ہے اور جب سلیمانی اتفاق سے اس کی ملاقات اپنی بہن سے ہوتی ہے اور وہ اپنے قریب المرگ باپ سے ملتی ہے تو وہ بستر مرگ پر اس کی جرأت کی داد دیتا ہے۔ میں بہت خوش ہوا ہوں بیٹی کہ تو نے اپنے بدکردار پتی کا گھر چھوڑ دینے کی ہمت کی۔ چنانچہ اس ہمت اور جرأت

کے انعام میں وہ اپنی ساری جائداد اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ تم اتنے دن کہاں رہیں۔ تم نے یہاں قدم رنجہ کیسے فرمایا؟

افسانے میں ایک اور ٹکڑہ بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ رتن لعل کے دل و دماغ میں شرمیتی ہیروئن کا خیال سمایا ہوا ہے۔ بروا صاحب نے ایک نہایت ہی بھونڈا پَچ دیا ہے۔ رتن لعل بازار میں جا رہا ہے کہ ایک دوست سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ دوست کہتا ہے "اماں اتنے روز تم کہاں رہے۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ آج ہم نے دعوت دی ہے۔ تم ذرا جادو کے کھیل دکھانا۔ جادو کے کھیل نہیں دکھلائے جاتے کیونکہ ان سے ڈائریکٹر کا مطلب پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ آوازوں کا نقال بنتا ہے اور شرمیتی ہیروئن سے بات چیت کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ پَچ بروا جیسے ڈائریکٹر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ٹیکنیکی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ غایت درجہ خام ہے اور اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈائریکٹر کہانی سناتے سناتے تماشائیوں کے کان میں یہ کہنا شروع کر دیتا ہے۔

ناظرین یہ یاد رکھئے گا ہمارے ہیرو کے دماغ میں اس وقت ہیروئن بسی ہوئی ہے۔ ہیروئن — سمجھ لیا — ہیروئن ۔

مختصر الفاظ میں زندگی کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک آہ ہے جو دو اہم لیبیٹ کر پیش کی گئی ہے۔ اس کا پیکنگ اچھا ہے۔ مسٹر بروا یورپ سے نمائش کاری کا یہ طریقہ شاید حال ہی میں سیکھ کر آئے ہیں۔ اور زندگی کی دُم میں نمدہ باندھنے کا کام بھی بروا صاحب نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ جس کی داد دئیے بغیر میں یہ مضمون ختم نہیں کر سکتا۔ ہندو نسلوں کی اوہام پرستی کو بروا صاحب نے بڑے سلیقے سے پیش کیا

ہے۔ جس کے متعلق بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ایک بہت بڑا طنز ہے۔ مثال کے طور پر وہ مندر والا سین جو مجھے بے حد پسند ہے۔ سہگل نے گانے بہت اچھے گائے ہیں۔ ایک اپنی مرضی سے، باقی جمنا کی مرضی سے۔ جب کبھی جمنا نے اس سے کہا۔ مجھے وہ گیت تو سناؤ تو سہگل نے انکار نہیں کیا۔ فوراً ہی بے چارے نے شروع کر دیا۔ ایسے ہیرو خاص طور پر ہیروئن کو بہت پسند ہوتے ہیں جو کبھی انکار نہ کریں۔

زندگی میں ایک کیرکٹر بہت دلچسپ ہے۔ شرابی کا جو پہاڑی صاحب نے ادا کیا ہے۔ افسانے میں اس کا کام صرف شراب پینا یا ایک کسبی سے اپنا دل بہلانا ہے۔ پہاڑی کو شرابی کے لباس میں دیکھ کر اس خشکی کے زمانے میں بھی کئی شرابیوں کو بہت غصہ آیا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ صحیح شرابی نہیں تھا۔

فلم میں شرابی اور آوارہ گردی کی تعریف بروا صاحب نے اچھوتے انداز میں کی ہے جو آرٹ کہلائی جا سکتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ بروا صاحب کی طرح اس ریویو کو بھی ایک فلم بنا دوں۔ مگر میری جیب میں کوئی نیو تھیئٹرز نہیں ہے۔ اور اگر نیو تھیئٹرز نہ ہوگا تو ایسا فلم کیونکر بنایا جا سکتا ہے۔

پس نقط

(اس ریویو کے بعد میں نے پھر ذیل کی سطور لکھیں) میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ "زندگی" میں زندگی نہیں ہے۔ اس میں موت ہے اور وہ بھی بے جان موت۔ "زندگی" دیکھنے کے بعد اب میں جب کبھی اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ربڑ کا رنگین غبارہ آ جاتا ہے، جس کی ہوا آہستہ آہستہ نکل رہی ہو۔ "زندگی" ہوا

بھرا غبارہ نہیں۔ ایک ایسا غبارہ ہے، جس میں بہت زیادہ ہوا بھر کے اُسے آہستہ آہستہ خالی کر دیا گیا ہو۔ اور آخر میں پھیچڑا سا بن کر رہ گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ افسانے میں سماج کے خلاف بغاوت ہے۔ ایک کمزور عورت اپنے نازک ہاتھوں سے سماج کے بندھن توڑتی ہے۔ "زندگی" میں نے ان دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مجھے یہ بغاوت اور یہ جرأت کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ بلکہ بُزدلی ہی بُزدلی دکھائی دی ہے۔ فلم کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جرأت کا نام و نشان تک نہیں۔

افسانے کا آغاز شریمان رتن لعل ہیرو کے مکان سے ہوتا ہے، جس کا کرایہ ادا نہیں کیا گیا۔ مالک مکان کی آواز سن کر ہیرو ڈر کے مارے بھاگ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد فلم میں جو منظر بھی آتا ہے، اس میں آپ شریمتی ہیروئن اور شریمان ہیرو دونوں کو غیر ــــ دشمنوں سے بھاگتے چھپتے پائیں گے۔

میں "زندگی" کے افسانہ نگار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہیں ڈر کس بات کا تھا ان کے دشمن کون تھے۔ ان کا تعاقب کرنے کی کسی کو ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ اتنے اہم نہیں تھے کہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوتے۔ پھر وہ چھپتے کیوں تھے؟ وہ ارتعاش خفی کیا تھا جو ہر وقت ہیرو اور ہیروئن پر طاری رہتا تھا؟ ذرا سی آہٹ پر اُن کا دل سینے سے اچھل کر باہر آجاتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ ...... شاید یہ کیفیت اس جرأت نے پیدا کر دی تھی۔ جو وہ دونوں اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ جرأت کس لئے پیدا کی جا رہی تھی؟ ــــ اس سوال کا جواب اگر عباس صاحب یا جمیل صاحب سے پوچھا جائے تو وہ ویسا ہی جواب دیں گے

جیساکہ "زندگی" اپنے موضوع سے متعلقہ سوالوں کا جواب دیتی ہے۔ مگر مجھ سے پوچھئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کیوں ہاں اور نہ کے درمیان تھے۔ کیوں وہ ایک دم بزدل اور جرأت مند تھے۔ کیوں ہر وقت ان کا ضمیر کشمکش و پیچ کی حالت میں رہتا تھا۔ کیوں وہ "وہ" نہیں تھے۔ جو کہ ہونا چاہئے تھا۔ مرد اور عورت کے درمیان سوائے وصل کے اور چیز ہی کیا ہے۔ شریمتی ہیروئن اپنے خاوند سے بیزار تھی۔ اس لئے کہ اس نے دھکے مار کر اسے باہر نکال دیا تھا۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی۔ محبت کرنے کی جسمانی طاقت اس کے دل و دماغ میں اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ اس نے اس پہلے مرد سے عشق کرنا شروع کر دیا۔ جو گھر سے باہر نکل کر اسے ملا۔ پردے پر عشق کا اظہار شریمتی ہیروئن کی طرف سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وہ بھوکی تھی اور یہ بھوک یکسر جنسی تھی۔ اس نے شریمان رتن لال کو اپنے مقفل عشق کی چابیاں دیتے وقت یہ نہیں سوچا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟ وہ بس ایک مرد چاہتی تھی جس کے ساتھ وہ کئی دنوں تک گھومتی پھرتی رہی۔ ایک رات وہ اس کے گھر میں بھی سوئی۔ اتنی جرأت اس نے کی لیکن اس کو آزادانہ طور پر اپنا بنا لینے کی جرأت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فلم میں رونا کس بات کا رویا گیا ہے۔

جب اس کو اتنی جرأت تھی تو کیا باقی چیزوں کی تکمیل کے لئے وہ مزید جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر سماج کو کیوں برا بھلا کہا گیا ہے۔ جب شریمتی ہیروئن رات کو رتن لعل کے گھر میں سونے کا ارادہ کر رہی تھی تو سماج نے کھاٹ تو نہیں الٹ دی تھی۔ جب وہ ہیرو کے ساتھ کھلے بندوں بازاروں میں چلتی پھرتی تھی تو سماج نے اس کی راہ میں کانٹے تو نہیں بچھا دیئے تھے۔ خواجہ عباس صاحب کچھ بھی کہیں مگر

یہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں جنسی تعلقات پیدا کرنے کے لئے مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ ان تعلقات پر سماج کو اعتراض نہ ہو۔

اس افسانے میں یہ جنسی سوال صرف دو افراد سے متعلق ہے۔ وہ جو چاہے کرتے۔ ان کے اعمال کا سماج کی چوڑی چھاتی پر کیا بوجھ پڑ سکتا ہے۔ کیا شرابی شوہروں کی دھتکاری ہوئی بیویاں غیر مردوں کی آغوش میں نہیں چلی جاتیں؟ اُن کے ایسا کرنے سے زندگی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سماج کے چہرے کا رنگ ان کے اس فعل سے نہیں بدلتا۔ دنیا میں کوئی بھونچال نہیں آتا۔ کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی۔ پھر ایک ایسے موضوع پر فلم تیار کرنا کیا معنے رکھتا ہے، جس کا عمومی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ "زندگی" خاص افراد کے جنسی ملاپ کی ناکامی کا افسانہ ہے، اسے باقی سب لوگوں سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔

"زندگی" گندے خون کے نکاس کا نام نہیں ہے۔ زندگی کا مفہوم مسئلہ ازدواج تک محدود نہیں ہے۔ زندگی مرد اور عورت کے ملاپ کا نام نہیں ہے۔ زندگی نام ہے حرکت کا۔ زندگی نام ہے کشمکش کا۔ زندگی نام ہے بیباکی کا۔ زندگی نام ہے زندہ رہنے کا۔ زندگی نام ہے زندہ رہنے کے مطالبے کا۔ ایک بے کار محض بے کار سست آدمی جس کی رگ رگ اور نس نس میں کاہلی سرایت کر گئی تھی۔ ایک ایم۔ اے جو اتنا اچھا گاتا تھا کہ ہزاروں روپیہ ماہوار کما سکے، جادو کے کھیل جانتا تھا۔ بے کار تھا اور جوئے میں ایک کھوٹی دوئنی جیت کر بازاروں میں گھومتا رہتا تھا۔ ایسا شخص کیا الف لیلہ کے مرد تسمہ پا کی طرح زندگی کی گردن پر سوار نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ آخر میں افسانہ نگار کے ہاتھوں ترقی پسند ہیروئن کی موت واقع ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسے ناکارہ اور

فضول شخص کے بوجھ سے زندگی کو ہلکا کر دیا جاتا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ شخص عشق بھی کرتا ہے اور سماج کو ایک ہی سانس میں دو دو سو گالیاں بھی دیتا ہے۔ اگر میں سماج ہوتا تو اس کے منہ پر ایسا "زندگی" بھر اچانٹا مارتا کہ پھر اس کو بے کار رہنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب شریمتی ہیروئن کا باپ اس بات سے خوش ہو کر کہ اس نے بہت بڑی جرأت کی ہے، اپنی ساری جائداد اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ خیرات دینا شروع کر دیتی ہے۔ ممکن ہے اس خیرات کا شریمتی ہیروئن کے ساتھ کوئی نفسیاتی رشتہ ہو۔ مگر میری سمجھ سے یہ بالاتر ہے۔ خیرات میں روپیہ صرف کر کے وہ کس قسم کی پیاس بجھانی چاہتی تھی۔ کیا وہ اپنی عاقبت سنوارنا چاہتی تھی۔ کیا وہ سورگ میں اپنے لئے کوئی اچھا سا بنگلہ ریزرو کرانا چاہتی تھی۔ آخر حاتم طائی کو شرمندہ کرنے کی ضرورت اسے کیوں لاحق ہوئی؛ خواجہ عباس صاحب کہتے ہیں۔ کہ جو "زندگی" دیکھنے جائے وہ اپنے ساتھ دو رومال لے کر جائے۔ بالکل درست ہے۔ ایک اپنے آنسو پونچھنے کے لئے اور دوسرا بردا کے! ....

عصمت فروشی

عصمت فروشی کوئی خلافِ عقل یا خلافِ قانون چیز نہیں ہے۔ یہ ایک پیشہ ہے جس کو اختیار کرنے والی عورتیں چند سماجی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ جس شے کے گاہک موجود ہوں۔ اگر وہ مارکیٹ میں نظر آئے تو ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اگر ہمیں ہر شہر میں ایسی عورتیں نظر آتی ہیں جو اس جسمانی تجارت سے اپنا پیٹ پالتی ہیں تو ہمیں ان کے ذریعہ معاش پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ ہر شہر میں ان کے گاہک موجود ہیں۔

عصمت فروشی کو گناہِ کبیرہ یقین کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بہت بڑا گناہ ہو۔ مگر ہم مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو جانچنا نہیں چاہتے۔ گناہ اور ثواب، سزا اور جزا کی بھول بھلیاں میں پھنس کر آدمی کسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر سکتا۔ مذہب خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اگر اس میں لپیٹ کر کسی اور مسئلے کو دیکھا جائے تو ہمیں بہت ہی مغز دردی کرنی پڑے گی۔ اس لئے مذہب کو عصمت فروشی سے الگ کر کے ہم نے ایک طرف رکھ دیا ہے۔

عصمت فروشی کیا ہے؟ —— عصمت کو بیچنا۔ یعنی اس گوہر کو بیچنا جس کو عورت کی زندگی کا سب سے قیمتی زیور یقین کیا جاتا ہے۔ اس زیور کی قدر اس لئے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کہ تجربہ نے ہمیں بتایا ہے کہ عورت جب ایک بار اس کو کھو دیتی ہے تو سماج کی نگاہوں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ یہ گوہر کئی طریقوں سے ضائع ہوتا ہے۔ جب عورت کی شادی ہو جائے تو یہ گوہر خاوند کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات مرد اسے زبردستی حاصل کر لیتے ہیں اور بعض اوقات شادی کے بغیر عورتیں اسے اپنے دل پسند مردوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ بعض حالات سے مجبور ہو کر اسے بیچ دیتی ہیں۔ اور بعض اس کی تجارت کرتی ہیں۔

ہم ان عورتوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو پیشے کے طور پر اپنی عصمت بیچتی ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل واضح چیز ہے کہ عصمت صرف ایک بار کھوئی یا بیچی جا سکتی ہے، بار بار اس کو بیچا یا کھویا نہیں جا سکتا۔ لیکن چونکہ اس پیشے کو عرف عام میں عصمت فروشی کہا جاتا ہے اس لئے ہم اسے عصمت فروشی ہی کہیں گے۔

عصمت فروش عورت ایک زمانے سے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھی جاتی رہی ہے۔ مگر کیا ہم نے غور کیا ہے کہ ہم میں سے اکثر ایسی ذلیل و خوار ہستیوں کے در پر ٹھوکریں کھاتے ہیں؟ —— کیا ہمارے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم بھی ذلیل ہیں۔

مقامِ تاسف ہے کہ مردوں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ مرد اپنے دامن پر ذلت کے ہر دھبے کو عصمت فروش عورت کے دل کی سیاہی سے تعبیر کرے گا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ عورتوں میں خواہ وہ کسبی ہوں یا غیر کسبی ہوں،

ننانوے فی صدی ایسی ہوں گی جن کے دل عصمت فروشی کی تاریک تجارت کے باوجود بدکار مردوں کے دل کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن ہوں گے۔ موجودہ نظام کے تحت جس کی باگ ڈور صرف مردوں کے ہاتھ میں ہے، عورت خواہ وہ عصمت فروش ہو یا باعصمت، ہمیشہ دبی رہی ہے۔ مرد کو اختیار ہوگا کہ وہ اس کے متعلق جو چاہے رائے قائم کرے۔

ہم نے متعدد بار اپنے کانوں سے تعیش پسند امیروں کو اپنا مال واسباب شہوت کے تنور میں ایندھن کے طور پر جلا کر یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں طوائف یا فلاں ویشیا نے ان کو تباہ و برباد کر دیا ہے ——— یہ معمّا ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

ویشیا یا طوائف اپنے تجارتی اصولوں کے ماتحت ہر مرد سے جو اس کے پاس گاہک کے طور پر آتا ہے، زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ مناسب داموں پر یا حیرت انگیز قیمت پر اپنا مال بیچتی ہے تو یہ اس کا پیشہ ہے بنیا بھی تو سودا تولتے وقت ڈنڈی مار جاتا ہے۔ بعض دکانیں زیادہ قیمت پر اپنا مال بیچتی ہیں، بعض کم قیمت پر۔

تعجب تو اس بات کا ہے کہ جب صدیوں سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ ویشیا کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا تو ہم کیوں اپنے آپ کو اس سے ڈسواتے ہیں اور پھر کیوں خود ہی رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ویشیا ارادۃً یا کسی انتقامی جذبے کے زیرِ اثر مردوں کے مال و زر پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔ وہ سودا کرتی ہے اور کماتی ہے۔ مرد اپنی جسمانی خواہشات کی تکمیل کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور بس۔

ممکن ہے ویشیا کسی مرد سے محبت کرتی ہو لیکن ہر وہ گاہک جو ایک خاص جذبے کے زیرِ اثر اس کی دکان میں جاتا ہے، دل میں یہ خواہش بھی پیدا کر لے کہ وہ اس سے سچی محبت کرے تو یہ کیونکر ممکن ہے؟ ہم اگر کسی دکان سے ایک روپے کا آٹا لینے جائیں تو ہماری یہ توقع قطعی طور پر مضحکہ خیز ہو گی کہ وہ ہمیں اپنے گھر میں مدعو کرے گا اور دسر کے گنج کا کوئی لاجواب نسخہ بتائے گا۔

ویشیا اپنے اس گاہک کے روبرو جو اس سے محبت کا طالب ہے اپنے چہرے پر مصنوعی محبت کے جذبات پیدا کرے گی۔ یہ چیز گاہک کو خوش کر دے گی۔ مگر یہ عورت اپنے سینے کی گہرائیوں میں سے ہر مرد کے لئے جو شراب پی کر اس کے کوٹھے پر جھومنے لگتا ہے اور رومان کی ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے، محبت کی پاک اور صاف آواز نہیں نکال سکتی۔

ویشیا کو صرف باہر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے رنگ روپ اس کی بھڑکیلی پوشاک اور اس کے مکان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر یہی نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ خوش حال ہے۔ یہ درست نہیں۔

جس عورت کے دروازے شہر کے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہیں جو اپنی جیبوں میں چاندی کے چند سکے رکھتا ہو۔ خواہ وہ موچی ہو یا بھنگی۔ لنگڑا ہو یا لولا۔ خوبصورت ہو یا کریہہ المنظر، اس کی زندگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بدصورت مرد جس کے منہ سے پائیوریا لگے دانتوں کے تعفن کے بھبکے نکلتے ہیں، ایک نفاست پسند ویشیا کے ہاں آتا ہے۔ چونکہ اس کی گرہ میں اس ویشیا کے جسم کو ایک خاص وقت تک خریدنے کے لئے دام موجود ہیں۔ وہ نفرت کے باوجود اس گاہک

کو نہیں موڑ سکتی۔ سینے پر پتھر رکھ کر اس کو اپنے اس گاہک کی بدصورتی اور اس کے منہ کا تعفن برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا ہر گاہک اپالو نہیں ہو سکتا۔

ٹائپسٹ عورتوں کو حیرت سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ عورتیں جو دایہ گیری کا کام کرتی ہیں، انہیں حیرت اور نفرت سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ عورتیں جو گندگی سر پر اٹھاتی ہیں، ان کی طرف حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن تعجب ہے کہ ان عورتوں کو جو اچھے یا بھونڈے طریقے سے اپنا جسم بیچتی ہیں حیرت، نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

حضرات یہ جسم فروشی ضروری ہے۔ آپ شہر میں خوبصورت اور نفیس گاڑیاں دیکھتے ہیں ـــــ یہ خوبصورت اور نفیس گاڑیاں کوڑا کرکٹ اٹھانے کے کام نہیں آسکتیں۔ گندگی اور غلاظت اٹھا کر باہر پھینکنے کے لئے اور گاڑیاں موجود ہیں، جنہیں آپ کم دیکھتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو فوراً اپنی ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں ـــــ ان گاڑیوں کا وجود ضروری ہے اور ان عورتوں کا وجود بھی ضروری ہے جو آپ کی غلاظت اٹھاتی ہیں۔ اگر یہ عورتیں نہ ہوتیں تو ہمارے سب گلی کوچے مردوں کی غلیظ حرکات سے بھرے ہوتے۔

یہ عورتیں اُجڑے ہوئے باغ ہیں، گھورے ہیں جن پر گندے پانی کی موریاں بہہ رہی ہوں۔ یہ ان گندی موریوں ہی پر زندہ رہتی ہیں ـــــ ہر انسان کیسے ایک جیسے شاندار طریقے پر زندگی بسر کر سکتا ہے؟

ذرا خیال فرمایئے۔ شہر کے ایک کونے میں ایک ویشیا کا مکان ہے رات

کی سیاہی ہیں ایک مرد جو اپنے سینے میں اس سے بھی زیادہ سیاہ دل رکھتا ہے، اپنے جسم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے بے دھڑک اس کے مکان میں چلا جاتا ہے۔ ویشیا اس مرد کے دل کی سیاہی سے واقف ہے۔ اس سے نفرت بھی کرتی ہے۔ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا وجود دامن انسانیت پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ ازمنۂ بربریت کا ایک خوفناک نمونہ ہے، مگر وہ اپنے گھر کے دروازے اس پر بند نہیں کر سکتی — جو دروازے معاشی کشمکش نے ایک دفعہ کھول دیئے ہوں، بہت مشکل سے بند کئے جا سکتے ہیں۔

یہ ویشیا جو عورت پہلے ہے، ویشیا بعد میں — اس مرد کو چند سکّوں کے عوض اپنا جسم حوالے کر دیتی ہے لیکن اس کی روح اس وقت جسم میں نہیں ہوتی۔ ایک ویشیا کے الفاظ سنئے "لوگ مجھے باہر کھیتوں میں لے جاتے ہیں — میں لیٹی رہتی ہوں بالکل بے حس و بے حرکت، لیکن میری آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ میں دُور — بہت دُور ان درختوں کو دیکھتی رہتی ہوں، جن کی چھاؤں میں کئی بکریاں آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہوتی ہیں۔ کتنا پیارا منظر ہوتا ہے — میں بکریاں گننا شروع کر دیتی ہوں یا پیڑوں کی ٹہنیوں پر کوّوں کو شمار کرنے لگتی ہوں — انیس، بیس — اکیس، بائیس ...... اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرا ساتھی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک طرف ہانپ رہا ہے۔"

مشاہدہ بتاتا ہے کہ ویشیائیں عام طور پر خدا ترس ہوتی ہیں۔ ہر ہندو ویشیا کے مکان پر کسی نہ کسی کمرے میں آپ کو کرشن بھگوان یا گنیش مہاراج کی مورتی یا تصویر ضرور نظر آئے گی۔ وہ اس مورتی کی اسی قدر صدق دل سے پوجا کرتی ہے

جتنی ایک باعصمت گھریلو عورت کرسکتی ہے۔ اسی طرح وہ ویشیا جو مسلمان ہے، ماہ رمضان میں روزے ضرور رکھے گی، محرم میں اپنا کاروبار بند رکھے گی، سیاہ کپڑے پہنے گی، غریبوں کی مدد کرے گی اور خاص خاص موقعوں پر خدا کے حضور میں عجز و نیاز کا نذرانہ بھی ضرور پیش کرے گی۔ بادی النظر میں عصمت باختہ عورتوں کو مذہب سے یہ لگاؤ ایک ڈھونگ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ ان کی روح کا وہ حصہ پیش کرتا ہے جو سماج کے زنگ سے یہ عورتیں بچا بچا کے رکھتی ہیں۔

دوسرے مذہب کی ویشیائیں بھی آپ کو روحانی طور پر اپنے اپنے مذہب کے ساتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ جکڑی نظر آئیں گی۔ کرسچین ویشیا گرجے میں نماز کے لئے ضرور جائے گی۔ کنواری مریم کی تصویر کے پاس دیا ضرور جلائے گی۔ دراصل اس تجارت میں ویشیا اپنے جسم کو لگاتی ہے نہ کہ روح کو۔ بھنگ یا چرس بیچنے والا ضروری نہیں کہ ان منشیات کا عادی ہو، ٹھیک اسی طرح ہر مولوی یا پنڈت پاکباز نہیں ہو سکتا۔

جسم داغا جا سکتا ہے مگر روح نہیں داغی جا سکتی۔

ویشیا اپنی تاریک تجارت کے باوجود روشن روح کی مالک ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے جسم کی قیمت بڑی بے دردی سے وصول کرتی ہو۔ مگر وہ غریبوں کی وسیع پیمانے پر مدد بھی کر سکتی ہے۔ بڑے بڑے امیر اس کے دل میں اپنی محبت پیدا نہ سکے ہوں۔ مگر وہ سڑکوں پر سونے والے ایک آوارہ گرد کی پھٹی ہوئی جیب میں اپنا دل ڈال سکتی ہے۔

ویشیا دولت کی بھوکی ہوتی ہے، لیکن کیا دولت کی بھوکی محبت کی بھوکی

نہیں ہوسکتی؟

یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں ہمیں تفصیل سے کام لینا پڑے گا۔ خاندانی ویشیا اور کسبیہ ویشیا میں بہت فرق ہے اور پھر وہ عورتیں یا لڑکیاں جو اپنے غریب ماں باپ یا اپنے یتیم بچوں کی پرورش کے لئے مجبوراً اپنا جسم چھپ چھپ کر فروخت کرتی ہیں، ان کی حیثیت متذکرہ صدر اقسام سے بالکل جداگانہ ہے۔

خاندانی ویشیا سے ہماری مراد وہ کسبی عورت ہے جو ویشیا کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اسی کے گھر میں پالی پوسی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ عورت جس کو خاص اصولوں کے تحت ویشیا بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسی عورتیں جو اس ماحول میں پرورش پاتی ہیں، عشق و محبت کو عام طور پر ایسا سکّہ تصور کرتی ہیں جو ان کے بازار میں نہیں چل سکتا۔ یہ نظریہ درست ہے اس لئے کہ اگر وہ ہر اس مرد کو جو ان کے پاس چند لمحات گزارنے کے لئے آئے، اپنا دِل حوالے کر دیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اس اسکول کی ویشیاؤں کے سینے میں عشق و محبت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دوسری عورتوں کے مقابلے میں مردوں سے عشق کرنے میں بڑی احتیاط اور بڑے بخل سے کام لیتی ہیں۔ مردوں سے روزانہ میل جول ان کے دل میں ایک ناقابلِ بیان تلخی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مردوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھنے لگتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اس ضمن میں ایک حد تک "منکر" ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا سینہ محبت کے لطیف جذبات سے

خالی ہوتا ہے۔

جس طرح بھنگن کی لڑکی کو گندگی کا پہلا ٹوکرا اٹھاتے وقت گھن نہیں آئے گی اسی طرح اپنے پیشے کا پہلا قدم اٹھاتے وقت ایسی ویشیاؤں کو بھی حجاب محسوس نہیں ہوگا۔ آہستہ آہستہ حیا اور جھجک سے متعلقہ قریب قریب تمام جذبات اُن میں گھس گھسا کر مٹ جاتے ہیں ــــ چکلے کے اندر جہاں شہوت پرست مردوں کے لئے ان عورتوں کے مکان کھلے رہتے ہیں، لطیف جذبات کیسے داخل ہو سکتے ہیں۔

جس طرح باعصمت عورتیں ویشیاؤں کی طرف حیرت اور تعجب سے دیکھتی ہیں ٹھیک اسی طرح وہ بھی اُن کی طرف اِسی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اول الذکر کے پیش نظر یہ استفہام ہوتا ہے "کیا عورت اس قدر ذلیل ہو سکتی ہے؟" مؤخر الذکر یہ سوچتی ہیں "یہ پاکباز عورتیں کیسی ہیں ــــ کیا ہیں؟"

ویشیا جس کی ماں ویشیا تھی جس کی دادی ویشیا تھی جس کی پردادی ویشیا تھی، جس نے ویشیا کا دودھ پیا، جو عصمت فروشی کے گہوارے میں پلی، وہیں بڑی ہوئی جس کی تجارت کا آغاز بھی وہیں شروع ہوا، عصمت اور باعصمت عورتوں کے تعلق کیا سمجھ سکتی ہے۔

ان سو لڑکیوں میں سے جو ویشیاؤں کے گھر میں پیدا ہوتی ہیں۔ شاید ایک دو کے دل میں اپنے گرد و پیش کے ماحول سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے جسم کو صرف ایک مرد کے حوالے کرنے کا تہیہ کرتی ہیں، لیکن باقی سب اسی راستے پر چلتی ہیں جو ان کی ماؤں نے ان کے منتخب کیا ہوتا ہے۔

جس طرح ایک دکاندار کا بیٹا اپنی نئی دکان کھولنے کا شوق رکھتا ہے اور

اس شوق کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ویشیاؤں کی جوان لڑکیاں اپنا پیشہ شروع کرنے کا بڑا چاؤ رکھتی ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی لڑکیاں نت نئے طریقوں سے اپنے جسم اور حُسن کی نمائش کرتی ہیں۔ جب وہ اپنی تجارت کا آغاز کرتی ہیں تو باقاعدہ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ ایک خاص اہتمام کے ماتحت یہ سب کچھ کیا جاتا ہے جیسا کہ دوسرے تجارتی کاموں کی بنیاد رکھتے وقت خاص رسوم کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

ان حالات کے تحت جیسا کہ ظاہر ہے، متذکرہ صدر قسم کی ویشیاؤں کے دِل میں عشق پیدا ہونا مشکل ہے۔ یہاں عشق سے ہماری مراد وہی عشق ہے، جو ہمارے یہاں عرصہ دراز سے رائج ہے۔ ہیر رانجھا اور سسی پنوں والا عشق۔

ایسی ویشیائیں عشق کرتی ہیں۔ مگر ان کا عشق بالکل جدا قسم کا ہوتا ہے۔ یہ لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے والا عشق نہیں کر سکتیں۔ اس لئے کہ یہ ان کی تجارت پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر کوئی ویشیا اپنے اوقات تجارت میں سے چند لمحات ایسے مرد کے لئے وقت کر دے جس سے اسے روپے پیسے کا لالچ نہ ہو تو ہم اسے عشق و محبت کہیں گے۔ اصولاً ویشیا کو صرف مرد کی دولت سے محبت ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی مرد سے اس کی دولت کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس کی خاطر ملے تو یہ اصول ٹوٹ جائے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ اُس ویشیا کی جیب نہیں بلکہ اس کا دل کارفرما ہے۔ جب دِل کارفرما ہو تو عشق و محبت کے جذبے کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

چونکہ عام طور پر عورت سے عشق و محبت کرنے کا واحد مقصد جسمانی لذت ہونا

ہے اس لئے ہم یہاں بھی جسمانی لذتوں ہی کو عشق کے اس جذبے کا محرک سمجھیں گے گو اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں اس کی تخلیق و تولید کی مہیج ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ولیشیا جو اپنے کوٹھے پر ہر مرد پر حکم چلانے کی عادی ہوتی ہے۔ غیر مختتم ناز برداریوں سے سخت تنگ آجاتی ہے۔ اس کو آقا بننا پسند ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ غلام بننا بھی چاہتی ہے۔ ہر فرمائش پوری ہو جانے میں اس کو بہت فائدہ ہے مگر انکار میں اور ہی لذت ہے۔ وہ ہر طرف سے دولت سمیٹتی ہے۔ یہ کام اس کا معمول بن جاتا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی کسی کے لئے خرچ کرے۔ اگر سب اس کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ بھی کسی کی خوشامد کرے۔ اگر وہ ضد کرتی ہے تو کوئی اس سے بھی ضد کرے۔ وہ سب کو دھتکارتی ہے تو کوئی اسے بھی دھتکارے ستائے مارے پیٹے۔ یہ تمام چیزیں مل کر اس کے دل میں ایک خاص مرد کو اپنا رفیق بنانے پر مجبور کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ انتخاب کرتی ہے۔

انتخاب کا یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے وہ کسی رئیس زادے پر اپنے دل کے خاص دروازے کھول دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے کوٹھے پر چلمیں بھرنے والے چرس نوش میراثی کے غلیظ قدموں میں اپنا وہ سر رکھ دے جس کے بالوں کو چومنے کے لئے بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں نے کئی کئی ہزار طلائی اشرفیاں پانی کی طرح بہا دی تھیں۔ اور پھر اس وقت بھی کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے جب وہ غلیظ آدمی اس سر کو ٹھوکر مار کر پرے ہٹا دے۔ اس قسم کے واقعات دیکھنے اور سننے میں آچکے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک مشہور طوائف اس وقت تک موجود ہے، جس کے عشق میں ایک نواب مدتوں لٹو بنا رہا مگر وہ ایک نہایت ہی معمولی آدمی کے عشق میں گرفتار تھی۔ طوائف نواب کے عشق کا مضحکہ اڑاتی تھی اور ادھر اس کے اپنے عشق کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ نواب طوائف کے عشق میں رسوا ہوا اور طوائف اس آدمی کے عشق میں بدنام ہوئی۔

عام عورتوں کے مقابلے میں ان ویشیاؤں کے عشق کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ مردوں کے ساتھ ملنے جلنے سے نت نئے عاشقانہ جذبات سے متعارف ہوتی رہتی ہیں۔ جب یہ خود اس میں گرفتار ہوتی ہیں تو ان کو جلن زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

ایسے بازاروں میں جہاں یہ عورتیں رہتی ہیں، آپ کو متذکرہ صدر قسم کی کئی کہانیاں سننے میں آسکتی ہیں۔ خاص کر ان تعیش پسند امیروں کو جن کی تھیلیوں کے منہ ان جسم فروش عورتوں کے کوٹھوں پر کھلتے ہیں۔ ایسی کہانیاں ازبر ہیں۔ جن کو وہ اکثر مزے لے لے کر دوسروں کو سنانے کے عادی ہیں۔ سارنگیے، میراثی طبلچی اور وہ لوگ جن کی آمد و رفت ایسے کوٹھوں پر عام رہتی ہے، آپ کو بہت دلچسپ قصے سنائیں گے۔

انہی لوگوں سے سنے سنائے قصوں میں ہم ایک ایسی ویشیا کی کہانی مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں جو کہ ہزاروں اور لاکھوں میں کھیلتی تھی۔ مگر اس کا دل ایک چیتھڑے لٹکانے مزدور کے کھردرے پیروں تلے ہر روز روندا جاتا تھا۔ وہ ہر شب اپنے دولتمند پرستاروں سے سیم و زر کے انبار جمع کرتی تھی مگر ایک مزدور کے میلے کچیلے سینے میں دھڑکتے

ہوئے دل تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ نازک بدن اس مزدور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کئی بار سڑک کے پتھروں پر سوئی۔

اس قسم کا تضاد و تخالف جو عشق و محبت کا اصلی رنگ ہے، قحبہ خانوں میں دیکھا جائے تو بہت شوخ پُراسرار حد تک رومانی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ صرف عقبی منظر ہے جو پیش منظر کے ہر نقش کو ابھارتا ہے۔ چونکہ عام طور پر ویشیا کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سونا کھودنے والی کُدال ہے اور محبت کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے۔ اس لئے جب کبھی کسی ویشیا کے عشق کی ایسی داستان سننے میں آتی ہے تو بڑی عجیب و غریب اور پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔ ہم ایسی داستانوں کو اسی وجہ سے عام عورتوں اور مردوں کے معاشقوں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی سے سنتے ہیں۔ جیسے کسی مافوق العادت حادثے کی تفصیل سن رہے ہیں۔ حالانکہ دل اور اس کی دھڑکنوں سے عصمت فروشی یا عصمت مآبی کا کوئی تعلق نہیں ـــــ ایک باعصمت عورت کے سینے میں محبت سے عاری دل ہو سکتا ہے اور اس کے برعکس چکلے کی ایک ادنیٰ ترین ویشیا محبت سے بھرپور دل کی مالک ہو سکتی ہے۔

ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی لیکن ہر ویشیا عورت ہوتی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

ویشیاؤں کے عشق میں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے۔ اُن کا عشق ان کے روزمرّہ کے معمول پر بہت کم اثر ڈالتا ہے۔ ایسی بہت کم طوائفیں ملیں گی جنہوں نے اس جذبے کی خاطر اپنا کاروبار قطعی طور پر بند کر دیا ہو (کسی شریف لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر شہر کا شریف دکاندار بھی اپنی دکان بند نہیں کرے گا) عام طور پر یہی دیکھنے

میں آیا ہے کہ وہ اپنے عشق کے ساتھ ساتھ اپنا کاروبار بھی جاری رکھتی ہیں۔ دراصل مال و دولت حاصل کرنے کی ایک تاجرانہ طلب ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نت نئے گاہک بنانا اور ہر روز اپنا مال بیچنا ایک عادت سی بن جاتی ہے اور یہی عادت بعد میں طبیعت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس طور پر کہ پھر اس کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ جس طرح گھر کے نوکر جھٹ پٹ اپنے آقاؤں کے بستر لگا کر اپنے آرام کا خیال کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ عورتیں بھی اپنے گاہکوں کو نمٹا کر اپنی خوشی اور راحت کی طرف پلٹ آتی ہیں۔

دل ایسی شے نہیں جو بانٹی جا سکے اور مرد کے مقابلے میں عورت کم ہرجائی ہوتی ہے۔ چونکہ ویشیا عورت ہے اس لئے وہ اپنا دل تمام گاہکوں میں تقسیم نہیں کر سکتی۔ عورت کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے محبت کرتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ ویشیا صرف اسی مرد پر اپنے دل کے تمام دروازے کھولے گی۔ جس سے اسے محبت ہو۔ ہر آنے جانے والے مرد کے لئے وہ ایسا نہیں کر سکتی۔

ویشیاؤں کے بارے میں عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ بڑی بے رحم اور جلاد صفت ہوتی ہیں۔ ممکن ہے سو میں سے پانچ چھ اس نوعیت کی ہوں مگر سب کی سب ایسی نہیں ہوتیں بلکہ یوں کہئے کہ نہیں ہو سکتیں۔ ویشیا اور با عصمت عورت کا مقابلہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ ان دونوں کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ویشیا خود کماتی ہے اور با عصمت عورت کے پاس کما کر لانے والے کئی موجود ہوتے ہیں۔

ہمارے کانوں میں ایک ویشیا کے یہ لفظ ابھی تک گونج رہے ہیں۔ جو اس کے دل کی تمام گہرائیاں پیش کرتے ہیں۔ آپ بھی سنئے!۔

"ویشیا ایک بے کس اور بے یار و مددگار عورت ہے۔ اس کے پاس ہر روز سینکڑوں مرد آتے ہیں، ایک ہی خواہش لے کر —— وہ اپنے چاہنے والوں کے ہجوم میں بھی اکیلی رہتی ہے —— بالکل تن تنہا —— وہ رات کے اندھیرے میں چلنے والی ریل گاڑی ہے جو مسافروں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر ایک آہنی چھت کے نیچے خالی کھڑی رہتی ہے۔ بالکل خالی دھوئیں اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی —— لوگ ہمیں بُرا کہتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ —— وہی مرد جو رات کی تاریکی میں ہم سے راحت مول لے کر جاتے ہیں، دن کے اجالے میں ہمیں نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں —— ہم کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ اور اس کو راز بنا کر نہیں رکھتیں۔ وہ ہمارے پاس یہ جنس خریدنے کے لئے آتے ہیں۔ اور اس سودے کو راز بنا کر رکھتے ہیں...... سمجھ میں نہیں آتا کیوں؟"

ذرا اس ویشیا کا تصور کیجئے جس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ ہو۔ نہ بھائی نہ بہن نہ ماں نہ باپ اور نہ کوئی دوست۔ اپنے گاہکوں سے فراغت پا کر جب وہ کمرے میں اکیلی بالکل اکیلی رہ جاتی ہوگی تو اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوگی؟ —— یہ تاریکی اس اندھیرے میں اور کتنی تاریک ہو جاتی ہوگی۔

اگر سارا دن ٹوکری ڈھونے کے بعد مزدور کو اپنی تھکان دور کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آئے، اپنی دل بستگی کے لئے بیوی کی باتیں اسے نصیب نہ ہوں، نہ اس کی ماں ہو جو اس کے تھکے ہوئے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی تمام کلفتیں دور کر دے

تو بتایئے اس مزدور کی کیا حالت ہوگی؟

اس مزدور اور اس ویشیا دونوں کی حالت ایک جیسی ہے۔

ویشیا ایک رنگین شے نظر آتی ہے — کیوں؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں اپنا دل ٹٹولنا پڑے گا۔ یہ کمزوری ہم مردوں کی نگاہوں کی ہے اور اس کمزوری کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اپنے آپ ہی سے بات چیت کرنا پڑے گی۔ اس بارے میں غور و فکر کے بعد ہم جو معلوم کر سکے ہیں یہ ہے۔

ویشیا کا نام لیتے وقت ہمارے دماغ میں ایک ایسی عورت کا تصور پیدا ہوتا ہے، جو مرد کی شہوانی خواہشات اس کی مرضی اور ضرورت کے مطابق پوری کر سکتی ہے۔ گو عورت اور ویشیا پن دو بالکل جدا چیزیں ہیں مگر جب ہم کسی ویشیا کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں تو اس وقت عورت معہ اپنے پیشے کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر اس کے ماحول اور اس کے پیشے کا بہت اثر پڑتا ہے، مگر کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب وہ ان تمام چیزوں سے الگ ہٹ کر صرف انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی ایسا وقت بھی ضرور آتا ہوگا جب ویشیا اپنے پیشے کا لباس اتار کر صرف عورت رہ جاتی ہوگی مگر افسوس ہے کہ ہم ہر وقت عورت اور ویشیا کو ایک ہی جگہ دیکھنے کے عادی ہیں۔

جب ویشیا کو ہم اس عینک سے دیکھیں تو ہمیں اس کے ساتھ ہی وہ چیز بھی نظر آتی ہے جسے ہم مرد عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں اور عیش و عشرت کا مطلب عام طور پر جسمانی لذت ہوتا ہے۔

جسمانی لذت کیا ہے؟

ایک وقتی حظ جو ہمیں اپنی بیوی یا کسی اور عورت کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ مرد اپنی بیویاں چھوڑ کر اس وقتی لذت کے لئے بازاری عورتوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ جب ان لوگوں کی جسمانی خواہشات گھر میں پوری ہو سکتی ہیں تو وہ اس کے لئے باہر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں؟

اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔ آپ کو ایسے کئی آدمی نظر آئیں گے جو گھر کے مرغن اور لذیذ کھانے چھوڑ کر ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو ہوٹلوں کے کھانے کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ ہوٹل کی چیزوں میں غذائیت کم ہوتی ہے مگر ان میں ایک اور شے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اسے ہم "ہوٹلیت" کہہ سکتے ہیں، ایک ایسی بُرائی جو وصف بن جاتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ ایک کشش بن جاتی ہے۔ اس میں ہوٹل کے مالکوں کے فن کا دخل بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جو ماحول ہوٹل میں میسر آ سکتا ہے۔ انہیں اپنے گھر میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ انسان طبعاً تنوع پسند ہے، اس لئے جب وہ اپنے روزمرّہ کے پروگرام میں تبدیلی چاہے تو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوٹلوں میں ان لوگوں کو اچھا کھانا نہیں مل سکتا اور اس میں کسی شک کی گنجائش کہاں! یہاں گھر کی بہ نسبت زیادہ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے مگر یہی چیز تو یہ لوگ چاہتے ہیں۔ یہی فرق تو انہیں گھر سے کھینچ کر ہوٹلوں میں لاتا ہے۔ یہ نادانی ہے مگر لطف

یہ ہے کہ انہیں اسی نادانی ہی میں تو مزا آتا ہے۔

ان شادی شدہ مردوں کا بھی یہی حال ہے جو اپنی بیویاں چھوڑ کر بازاری عورتوں کے آغوش میں لذّت تلاش کرنے آتے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آیا اِن لوگوں کو اس تلاش میں کامیابی ہوتی ہے؟ — ہم کہیں گے یقیناً — جن عورتوں کے پاس یہ لوگ جاتے ہیں اس فن کی ماہر ہوتی ہیں۔ وہ یہی چیز تو بیچتی ہیں۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہے۔ کہ گھریلو عورتوں سے بالکل مختلف رنگ کی لذّت پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کا کاروبار کیسے چل سکتا ہے؟

جیسا کہ ہم اس مقالے کے آغاز میں کہہ چکے ہیں، عصمت فروشی خلافِ عقل چیز نہیں۔

میکسم گورکی

۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۸۹۰ء کا درمیانی زمانہ جو خاص طور پر عقیم ہے، روس کی تاریخ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ دوستووسکی ۱۸۸۱ء میں پیوندِ خاک ہوا۔ تورگنیف ۱۸۸۳ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اور تالستائی کچھ عرصہ کے لئے صناعانہ تصانیف سے روکش رہا۔ جب اس نے قلم اٹھایا تو "اینا کرینیا" اور "وار اینڈ پیس" کے مصنف نے بالکل جدا اسپرٹ میں اپنے افکار کو پیش کیا۔ اسی دوران میں روسی معاشرت کی تبدیلیاں نمایاں طور پر ظاہر ہو گئیں۔ ۱۸۶۳ء میں مزارعوں کی آزادی کے بعد ملک کی صاحبِ اقتدار جماعت نے رفتہ رفتہ معاشی اقبال اور سیاسی اہمیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بیشتر سرمایہ دار قریب قریب تباہ ہو چکے تھے اور ان کی جائدادیں نو کسبیہ تاجروں کے ہاتھوں میں جا رہی تھی۔

الگزنڈر سوئم (۱۸۸۱-۱۸۹۴) کا عہد حکومت اور نکولس دوئم (۱۸۹۴-۱۹۱۷) کی حکمرانی کے پہلے چند سال روس کی اندرونی سیاسیات کا بدترین زمانہ ہے، جذبۂ اصلاح کا وہ جوش جو الگزنڈر دوم کے عہد میں روسی معاشرہ کی رگوں میں موجزن تھا، اب

سرد ہوچکا تھا۔ مہذب روسی معاشرتی سوالات سے دور ہٹ کر صرف اپنے ذاتی معاملوں پر غور کرتے تھے۔ دوسری طرف انیسویں صدی کے آخری برسوں میں مصنوعات نے بڑی ترقی کی اور بیشتر کسانوں نے کارخانوں کی مزدوری اختیار کرلی۔ یہ کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر شہروں میں آباد ہوگئے۔ مگر پھر بھی ان کا اپنے دیہاتوں سے تعلق قائم رہا۔ جہاں وہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ملک میں خانہ بدوش مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ مزدوروں کی یہ جدید جماعت مارکس کی اشتراکی پروپیگنڈے کے لئے بہت موزوں تھی جو بعد میں روسی انقلاب کی محرک ہوئی۔

دو مصنف جو روس کے اس متبدل معاشرتی نظام کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چیخوف اور گورکی ہیں۔

چیخوف کی وفات سے قبل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تصانیف نے حقیقت نگاری کے سنہرے زمانے کا افتتاح کیا ہے۔ جس کا وہ انجام کار صرف پیش آہنگ تھا۔

۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء کے درمیانی عرصے میں بہت سے نوجوان ادیب یکے بعد دیگرے روسی فضا میں ابھرے۔ ان ادباء نے مقامی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ اکنافِ عالم میں بھی اپنے نام کا ڈنکا بجوایا۔ دوستوفسکی اور تورگنیف سے بڑھ کر ان کو مقبولیت حاصل ہوئی، جن میں گورکی اور اینڈریف کے نام خاص مرتبہ اور حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس عصر کے ادیبوں کی اجتماعی ادبی سرگرمیوں کو گورکی اینڈریف سکول کہیں گے۔ اس لئے کہ وہ تمام انشا پرداز جو اس اسکول میں شامل تھے، اپنے ہمراہ ایسی مشترکہ خصوصیات رکھتے ہیں۔ جو افسانہ نگاری کے قدیم پری چیخوف سکول سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

جس سکول کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں گورکی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ ہمیں اس اسکول کے اکثر اراکین کی تحریروں پر اس کے افکار کا اثر نظر آتا ہے۔ اس اثر کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ گورکی ہی پہلا شخص تھا۔ جس نے روسی حقیقت نگاری سے "ملائم" اور "مطہر" عناصر یک قلم خارج کر دیئے۔

روسی حقیقت نگاری اخلاقیات کے معاملہ میں ہمیشہ نرم و نازک رہی تھی۔ روسی ادیب، فرانسیسی ناولسٹوں کی خام کاری اور حد سے متجاوز صاف گوئی سے پرہیز کرتے تھے۔ اس زمانے کا روسی ادب کسی حد تک انگریزی وکٹورین ناول سے مشابہت رکھتا ہے۔ بھدا پن، نجاست اور صنفی رشتوں کا شہوانی پہلو روسی مصنف کے لئے ہمیشہ شجر ممنوع رہا تھا۔

یہ ادبی معاہدہ "تالستائی نے منسوخ کیا۔ جس نے پہلی مرتبہ موت اور بیماری کی جسمانی ہیبتوں کو اپنا موضوع قرار دے کر "ایوان ایلیچ کی موت" نامی ایک تمثیل سپردِ قلم کی۔ اور محبت کے شہوانی پہلو کی "کروتزر سوناٹا" کے اوراق میں نقاب کشائی کی۔ تالستائی نے ان دو کتابوں کے تعارف سے در حقیقت انیسویں صدی کے ممنوعات اور اعتقادات کی بنیادیں قطعی طور پر ہلا دیں۔ وہ کام جو تالستائی نے شروع کیا تھا، گورکی، اینڈریف اور آرٹی بے شیف کے ہاتھوں تکمیل حاصل کرتا رہا۔ علاوہ بریں جدید آرٹ کا بانی ہونے کی حیثیت میں بھی تالستائی کا اثر کافی و وافی تھا ——— افسانہ نگاری کے مافوق الطبعی مسئلے نے جو اس کے زیرِ نظر تھا، خاص طور پر اینڈریف اور آرٹی بے شیف کے ہاتھوں خوب نشوونما حاصل کی۔

ادب پر چیخوف کا اثر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک حد تک مختصر افسانہ نگاری کو روس میں مروّج و مقبول کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ بیشتر نوجوان افسانہ نگاروں نے چیخوف کا چربہ اتارنے یعنی اس کی صناعانہ باریک روی کو اپنانے کی کوشش کی۔ مگر اس فن میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہ ٹھیر سکا۔ گو ہمیں اس نقال افسانہ نگاروں کی عبارت میں چیخوف کی دل پسند تراکیب اور اظہار خیال کی مخصوص طرز ملتی ہے مگر یہ حقیقت ہے اس کی صنعت بیانی کو وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیانی عرصہ میں روسی ادب دو مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اوّلاً۔ گورکی اینڈ ریف سکول۔

ثانیاً اشارہ نگار اور ان کے پیرو۔ یہ لوگ ایسے جدید کلچر کے مبلّغ تھے جس نے روسی اذہان کی خوب تربیت کی اور طبقۂ علمی کو بہ یک وقت یورپی اور قومی بنا دیا۔

روسی ادب کی حیاتِ تازہ میں میکسم گورکی کا نام بلند ترین مرتبہ رکھتا ہے۔ جدید انشا پردازوں میں صرف گورکی ہی ایسا ادیب ہے جو ٹالسٹائی کی طرح اکنافِ عالم میں مشہور ہے۔ اس کی شہرت چیخوف کی مقبولیت نہیں جو دنیا کے چند ممالک کے علمی طبقوں تک محدود ہے۔

گورکی کا کردار فی الحقیقت بہت حیرت افزا ہے۔ غریب گھرانے میں پیدا ہو کر وہ صرف تیس سال کی عمر میں روسی ادب پر چھا گیا۔

طبقۂ ادنیٰ کا شاعر بیسویں صدی کا بائرن میکسم گورکی زندگی کی تاریک ترین

گہرائیوں کے بطن سے جو جرائم مصائب اور بدیوں کا مسکن ہے، پیدا ہوتا ہے۔ اس نے فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا پھیلا کر روٹی کے سوکھے ٹکڑے کے لئے التجا نہ کی اور نہ جوہری کی طرح اپنے بیش قیمت جواہرات کی نمائش سے لوگوں کی آنکھوں میں چکاچوند ہی پیدا کرنا چاہی۔ نزہنی نووگورد کا یہ معمولی باشندہ اپنے حریت پسند افکار سے روسی ادب کی اندھی شمع کو تابانی بخشنے کا آرزومند تھا۔ مردہ زرد اور بے جان ڈھانچوں میں حیاتِ نو کی تڑپ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

میکسم گورکی کا اصلی نام الیکسی میکسی موورخ پیشکوف ہے۔ اس کا باپ میکسیم پیشکوف ایک معمولی دکاندار تھا جو بعد ازاں اپنی علو ہمتی اور محنت کشی سے استراخاں میں جہاز کا ایجنٹ بن گیا۔ اس نے نزہنی نووگورد کے ایک رنگ ساز وسیلی کیشرن کی لڑکی سے شادی کی۔ جس کے بطن سے میکسم گورکی ۱۴ مارچ ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوا۔ پیدائش کے فوراً بعد ہی باپ اپنے بچے کو استراخاں لے گیا۔ یہاں گورکی نے ابھی اپنی زندگی کی پانچ بہاریں دیکھی تھیں کہ باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اب گورکی کی ماں اسے پھر سے اس کے دادا کے گھر لے آئی۔

گورکی نے اپنے بچپن کے زمانے کی داستان اپنی ایک تصنیف میں بیان کی ہے۔ اس میں اس نے اپنے جابر دادا اور رحم دل دادی کے کرداروں کی نہایت فن کاری سے تصویر کشی کی ہے، جس کے نقوش قاری کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں کم سن گورکی بڑا ہوتا گیا۔ اس کے گرد وپیش کا افلاس زدہ ماحول تاریک سے تاریک تر ہوتا گیا۔ اس کی ماں نے جیسا کہ گورکی لکھتا ہے۔ "ایک نیم عاقل شخص سے شادی کر لی۔"

اس شخص کے متعلق گورکی کی کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔

کچھ عرصے کے بعد اس کی والدہ بھی اسے داغِ مفارقت دے گئی ۔ اور ساتھ ہی اس کے دادا نے اسے خود کمانے کے لئے اپنے گھر سے رخصت کر دیا۔ تقریباً دس سال تک نوجوان گورکی روس کی سرحدوں پر فکرِ معاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کشمکشِ زیست کے اس زمانے میں اسے ذلیل سے ذلیل مشقت سے آشنا ہونا پڑا۔

لڑکپن میں اس نے ایک کفش دوز کی شاگردی اختیار کر لی۔ یہ چھوڑ کر وہ ایک مدت تک دریائے والگا کی ایک دخانی کشتی میں کھانا کھلانے پر نوکر رہا۔ جہاں ایک بوڑھے سپاہی نے اسے چند ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور اس طرح اس کی ادبی زندگی کا سنگ بنیاد رکھا۔

ان کتابوں میں سے جو گورکی نے تختۂ جہاز پر بوڑھے سپاہی سے پڑھیں، ایک کتاب "اڈلفو کے اسرار" تھی، ایک مدت تک اس کے زیرِ مطالعہ ایسی کتب رہیں جن کے اوراق عموماً کشت وخون اور شجاعانہ رومانی داستانوں سے لبریز ہوا کرتے تھے، اس مطالعہ کا اثر اس کی اوائلی تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں گورکی نے قازان کے ایک سکول میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ مگر جیسا کہ وہ خود کہتا ہے۔ ان دنوں مفت تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا۔ وہ اپنے اس [illegible] میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اُسے بھوکوں مرنے سے بچاؤ حاصل کرنے کے لئے ایک بسکٹوں کے کارخانے میں کام کرنا پڑا۔ یہ وہی کارخانہ ہے جس کی تصویر اُس نے اپنے شاہکار افسانے "چھبیس مرد اور ایک دوشیزہ" میں نہایت

فن کاری سے کھینچی ہے۔

قازان میں اسے ایسے طلبہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جنہوں نے اس کے دماغ میں انقلابی خیالات کی تخم ریزی کی۔ قازان کو خیرباد کہنے کے بعد وہ جنوب مشرق اور مشرقی روس کے میدانوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ اس زمانہ میں اس نے ہر نوعیت کی مشقت سے اپنا پیٹ پالا۔ اکثر اوقات اسے کئی کئی روز فاقے بھی کھینچنے پڑے۔

۱۸۸۹ء میں وہ نزہنی میں رنگروٹ بھرتی ہونے کے لئے آیا۔ خرابیٔ صحت کی بنا پر اسے یہ ملازمت تو نہ مل سکی۔ مگر وہ نزہنی کے ایک وکیل مسٹر ایم۔ اے لینن[۱] کے یہاں منشی کی حیثیت میں نوکر ہو گیا۔ اس وکیل نے اس کی تعلیم کی طرف بہت توجہ دی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی گورکی کے ذہنی تلاطم نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ منشی گیری چھوڑ کر روس کی سرحدوں پر آوارہ پھرے — دراصل قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مستقبل قریب کا ادیب اتنے عرصے تک دنیا کی نظروں سے روپوش رہے۔

خانہ بدوشی کی اس سیاحت کے زمانے میں گورکی[۲] نے اپنا قلم اٹھایا۔ ۱۸۹۲ء میں جب کہ وہ تفلس کے ایک ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا، اس کا پہلا افسانہ "ماکار شدرا" جو ایک نہایت دلچسپ رومانی داستان تھی۔ مقامی روزنامہ "قفقاز" میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں اس نے خود کو اپنے قلمی نام گورکی سے متعارف کرایا۔

---

[۱] گورکی اپنے اس محسن کا بہت احترام کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ مسٹر ایم۔ اے لینن کے نام سے معنون کیا ہے۔ [۲] گورکی کے لفظی معنی کڑوا یا ملول ہے۔

کچھ عرصہ تک وہ اپنے صوبے کے اخباروں میں مضامین چھپوانے کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اپنی تحریروں سے روپیہ پیدا کر سکے۔ مگر اعلیٰ ادب کے ایوان میں وہ اس وقت داخل ہوا جب اس نے دوبارہ نزہنی میں اقامت اختیار کی۔

کورلنکو[1] ان دنوں نزہنی میں تھا۔ اس نے گورکی کا ایک افسانہ "چلکاش" اپنے اثر و رسوخ سے اس وقت کے ایک موقر مجلہ میں شائع کرایا۔ گو میکسیم گورکی نے پراونشل پریس کی قلمی اعانت جاری رکھی۔ مگر پیٹرزبرگ کے رسائل بھی اس کے مضامین شکریہ کے ساتھ شائع کرنے لگے ـــــ ۱۸۹۵ء میں اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ان افسانوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ فی الحقیقت روسی انشا پرداز کے لئے اس قسم کی شاندار کامیابی غیر مسبوق تھی۔ اس کتاب کے تعارف کے ساتھ ہی گورکی ایک غیر معروف جرنلسٹ سے ملک کا مشہور ترین انشا پرداز بن گیا۔

گورکی کی شہرت "پہلے انقلاب" تک قابلِ رشک تھی۔ ملک کے تمام اخبار

---

[1] ولیڈیمر کارلنکو۔ جنوبی روس میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا۔ روس کے دیگر ادبا کی طرح وہ حصولِ تعلیم سے سیاسی وجوہ کی بنا پر تشنہ رہا۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اسے ماسکو کے زراعتی سکول کو خیرباد کہنا پڑا۔ اسے ۶ سال کا طویل عرصہ سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں کاٹنا پڑا۔ زمانہ اسیری کے بعد وہ موضع نزہنی میں اقامت پذیر ہوا، جہاں وہ مدت تک ایک رسالہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اسی زمانہ میں گورکی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کارلنکو روسی ادب میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔

اس کی تصاویر اور اس کے ذکر سے بھرے ہوتے تھے۔ ہر شخص اس کے سراپا کو ایک نظر دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بین الملی شہرت بھی فوراً ہی نوجوان مصنف کی قدم بوسی کرنے لگی۔ جرمنی بالخصوص اس پر لٹو ہو گیا ــــــ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیانی عرصہ میں گورکی کی شاہکار تمثیل "تاریک گہرائیاں" برلن کے ایک تھیٹر میں متواتر پانچ سو راتوں تک سٹیج ہوتی رہی۔

پیٹرز برگ میں گورکی کا بیشتر وقت مارکسیوں کی صحبت میں گزرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مارکسی بن گیا۔ اور اس نے اپنی دو تصانیف "وہ تینوں" اور "فوما" ایک مارکسی مجلّہ کے سپرد کر دیں۔ یہ دونوں کتابیں اس رسالے میں بالاقساط شائع ہوئیں۔ گورکی کے ایک گیت کی اشاعت کی وجہ سے یہ رسالہ حکومت نے ضبط کر لیا۔ یہ گیت آنے والے انقلاب کی ایک بے نقاب تمثیل تھی۔

میکسم گورکی اب روس کی جمہوریت پسند دنیا کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور شخصیت تھی۔ مالی نقطۂ نظر سے بھی اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کی تصانیف کا پیدا کردہ روپے کا بیشتر حصہ انقلاب کی تحریک میں صرف ہوتا رہا۔ خرچ کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء کے اختتام تک جاری رہا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ گورکی اپنی کتابوں کی مقبولیت اور حیرت افزا فروخت کے باوجود اپنی محنت کے ثمر سے پوری طرح حظ نہ اٹھا سکا۔

۱۹۰۰ء میں روس کی فضا سخت مضطرب تھی۔ گرفتاریوں اور سزاؤں کی بھرمار تھی۔ چنانچہ گورکی گرفتار ہوا۔ اور اسے پیٹرز برگ سے نکال کر نزہنی میں نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۰۰ء میں اسے "امپیریل اکیڈیمی آف سائنس" کا اعزازی رکن منتخب کیا گیا۔

مگر چونکہ نئی اکادمی پولیس کی زیرِ نگیں تھی۔ اس لئے حکومت نے فوراً ہی اس انتخاب کو رد کر دیا۔ اس پر کورلنکو اور چیخوف سخت مشتعل ہوئے اور احتجاج کے طور پر اکادمی سے علیحدہ ہو گئے۔

پہلے انقلاب میں گورکی نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری نے اکنافِ عالم میں گورکی کے چاہنے والے پیدا کر دیئے۔

رہائی کے بعد گورکی نے ایک روزانہ اخبار شائع کیا، جس کے کالم بالشویک تحریک کے نشوو ارتقا کے لئے مخصوص تھے۔ اس روزنامے میں گورکی نے بیسویں صدی کے تمام روسی ادبار کو بیہودہ قرار دیتے ہوئے مقالوں کا ایک تانتا باندھ دیا۔ ان انشاء پردازوں میں جو اس کے نزدیک فضول تھے، ٹالسٹائی اور دوستووسکی بھی شامل تھے، وہ انہیں ادنیٰ سرمایہ دار کا نام دیتا ہے۔

اس زمانے میں روس کے غیر ملکی قرضوں کی بہت مخالفت ہو رہی تھی۔ گورکی نے اس تحریک میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور دسمبر میں ماسکو کی "مسلح ابغاوت" کی ہر ممکن طریق پر مدد کی۔

۱۹۰۶ء میں روس چھوڑ کر وہ امریکہ چلا گیا۔ اس کا فن لینڈ اور سکنڈے نیویا کا سفر ایک پرشکوہ اور ظفر مند جلوس کی صورت میں تھا۔ امریکہ میں اس کا استقبال نہایت شاندار طریقے پر کیا گیا۔ مگر فوراً ہی وہاں کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ گورکی جس عورت کے ہمراہ رہتا ہے اور جسے اپنی منکوحہ بیوی بتاتا ہے، فی الحقیقت اس کی بیوی نہیں۔ اس واقعہ نے امریکیوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ اسے

ہوٹل چھوڑ دینے کے لئے کہا گیا۔ اور ایک دعوت میں جو اس کے اعزاز میں دی جا رہی تھی، مارک ٹوین نے صدارت سے انکار کر دیا۔ قدرتی طور پر گورکی "طہارت" کے اس غیر متوقع جذبے سے سخت رنجیدہ ہوا۔ جو ایک روسی کے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ اس ذہنی تکدر نے اسے چند امریکی افسانے سپردِ قلم کرنے پر مجبور کیا۔ جو ۱۹۰۶ء میں "پیلے بھوتوں کا شہر" کے معنی خیز عنوان سے شائع ہوتے رہے۔

یورپ واپس آنے پر وہ "کیپری" میں سکونت پذیر ہوا۔ جہاں وہ "جنگ" سے کچھ عرصہ پہلے تک مقیم رہا۔ یہاں کے لوگوں میں اسے بہت ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔

میسینا کی ہولناک آفت کے بعد ریلیف کے کاموں میں حصّہ لینے کی وجہ سے اٹلی گورکی کا گرویدہ ہو گیا۔ اسی عرصہ میں روس کے ادبی حلقوں میں اس کی شہرت کم ہونے لگی "تاریک گہرائیاں" کے بعد کی تصانیف کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو ہونا چاہیئے تھی۔ رفتہ رفتہ گورکی جو ۱۹۰۶ء تک بڑا ہر دل عزیز مصنف تھا، بالشویک پارٹی کا پٹھو بن کر رہ گیا۔"

"پرنس۔ ڈی۔ الیس میرسکی کونٹپریری رشین لٹریچر)

گو ادبی حلقوں میں اس کی شہرت کو اس طرح زوال پہنچا۔ مگر دوسری طرف اس کے افکار روسی مزدوروں کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے۔ روسی مزدوروں کی وہ ذہنیت جو ہمیں ۱۹۱۷ء تک نظر آتی ہے۔ دراصل گورکی کی تصانیف کی مرہونِ منت ہے۔ روس واپس آنے پر اس نے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ مگر یہ

لہ امریکہ کا مشہور مزاح نگار

مقبول نہ ہوا۔

جنگ عظیم چھڑنے پر گورکی نے بین الملی پوزیشن اختیار کر لی۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے اپنے قدیم دوستوں یعنی بالشویکوں کی مدد کی۔ مگر یہ امداد غیر مشروط نہ تھی گو اس کا اثر لینن اور اس کی پالیسی کے حق میں تھا مگر اس نے اس دفعہ خود کو پارٹی کا طرف دار ظاہر نہ کیا۔ بلکہ غیر جانبدار اور امن پسند رہنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ بھاری بھرکم برتری اور مشفق مگر حرف گیر علیحدگی دیر تک قائم رہی۔

بالشویکوں نے اس رویے پر ضرورت سے زیادہ سرگرمی کا اظہار نہ کیا لیکن ایک طرف گورکی کے بالشویک پارٹی کے سرکردہ لیڈروں سے ذاتی تعلقات، دوسری طرف اس کی بیرونی شہرت کی فراوانی نے اسے ایک اعلیٰ حیثیت بخشی ۔۔۔ ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک قطعی طور پر سوویٹ روس میں پبلک کی آزاد قوت صرف گورکی ہی تھا۔

گورکی کے غیر جانبدارانہ رویہ کو قابلِ تحسین قرار نہ دیا جائے۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس ہولناک زمانہ میں اس کی سرگرمیاں قابلِ صد آفرین ہیں۔ اگر وہ اس سے قبل امن پسند اور تہذیب و تمدن کا حامی بننے کا جھوٹا دعوےٰ کر رہا تھا تو اس نے اس مرتبہ فی الواقع اپنے آپ کو ایسا ثابت کر دکھایا۔ روسی تمدن درحقیقت گورکی کی اخلاص کیشانہ سرگرمیوں کا شرمندۂ احسان ہے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران میں ہر وہ کوشش جو روسی انشا پردازوں اور دیگر صحافیوں کو گرسنگی سے بچانے کے لئے عمل میں لائی گئی، صرف گورکی کی توجہ کا نتیجہ تھی۔ اس نے اس غرض کے لئے اپنے سیاسی دوستوں کی مدد سے ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا، جہاں روسی ادباء سے

غیر ملکی زبانوں کے تراجم کرائے جاتے تھے اور اس طرح انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو جاتا تھا۔

۱۹۱۹ء میں گورکی نے "تالسٹائی کی یاد کی جھلکیاں" شائع کی۔ اس تصنیف سے ایک بار پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ فی الواقع اعلیٰ پائے کا مصنف ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی پہلی سی عظمت دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔

۱۹۲۲ء میں اس نے روسی کسانوں پر ایک زبردست مقالہ لکھا جس میں اس نے اس جماعت کو غیر معمولی ترش الفاظ میں ملامت کرتے ہوئے اسے ہر برائی کا منبع قرار دیا ہے۔ گورکی اس جماعت کے افراد کو اس لئے بھی مورد الزام ٹھیراتا ہے کہ انھوں نے قومی تہذیب کی تاسیس میں کوئی حصہ نہ لیا۔

۱۹۲۲ء کے آخر میں گورکی نے روس کو خیرباد کہہ کر جرمنی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی صحت جو پہلے ہی بہت خراب تھی۔ اور زیادہ خراب ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے قلم اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ایک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اخباری اور محض سیاسی تحریروں کو شامل نہ کرتے ہوئے ہم گورکی کی باقی تصانیف تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ وہ مختصر افسانے جو ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی عرصہ میں سپرد قلم ہوئے اور جن کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔

۲۔ اس کے معاشرتی ناول اور ڈرامے جو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۱۲ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے ہیں۔

۲۔ ۱۹۱۳ء سے لے کر اس وقت تک کی تمام تحریریں جو زیادہ تر سوانح حیات اور تذکروں کی شکل میں ہیں۔

گورکی کی تصانیف کا پہلا اور آخری دور۔ درمیانی زمانے کی تحریروں کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان تحریروں میں ہم اس کی تخلیقی قوت ایک حد تک ضعیف دیکھتے ہیں۔

گورکی کی اوائلی تصانیف کی حقیقت نگاری میں رومانیت بدرجہ اتم موجود ہے رومانیت کا یہی عنصر روس میں اس کی مقبولیت کا باعث ہوا لیکن اس کے برعکس غیر ممالک میں اس کی شہرت کا باعث اس کی حقیقت نگاری ہے۔

اس کے پہلے افسانوں کی تازگی روسی قاری کی نظر میں صرف اس کے جوان اور بے باک افکار تھے۔ لیکن غیر ملکی قاری اس خام اور ستم کار انداز بیان میں تازگی محسوس کرتا تھا جس کے ذریعے اس نے اپنی دوزخ نما دنیا کی تصویر کشی کی ہے۔

(کونٹمپریری رشین ناولسٹس۔ سرگ پرسکی)

ان سطور سے ہمیں "اوائلی گورکی" کے متعلق روسی اور غیر روسی قاری کی پسندیدگی کے تقابل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس تضاد کی وجہ فی الحقیقت "عقبی مناظر" کا تخالف ہے۔ روسیوں نے اس کے افکار کو چیخوف اور ۱۸۸۰ء کے دیگر انشاپردازوں کے گرائے ہوئے مغموم اور یاس آفریں پردے پر دیکھا اور غیر ملکیوں نے عہد وکٹوریہ کی مزوج و پرسکون حقیقت نگاری کے پردے پر۔

گورکی کے شروع شروع کے افسانے بالکل رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں ان افسانوں میں "مکار شدرا" اور "راز رگل ___ بڈھا آدمی" کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں کی رومانیت نمائشی اور تھیٹری ہے۔ لیکن اسی رومانیت نے چیخوف سے اچاٹ روسی قاری کی نظر میں گورکی کا رتبہ پیدا کیا۔ اس کی یہ رومانیت ایک ایسے فلسفے کی شکل اختیار کر گئی جسے اس نے بڑے خام اور سادہ انداز میں اپنی ایک کہانی میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی کا مطلب یہ ہے کہ وہ دروغ جو روح کو سرفرازی بخشے، بہتر ہے اس سچائی سے جو ذلت آفرین ہو۔

۱۸۹۵ء میں گورکی نے دفعتاً چوروں اور جنگلی انسانوں کی داستانیں قلم بند کرنا چھوڑ کر نیا رخ بدلا۔ اب اس نے جو روش اختیار کی، وہ حقیقت نگاری کی تشکیل اور رومانیت کا اجتماع تھا۔ اس کا پہلا افسانہ "چلکاش" جو بڑے پریس میں شائع ہوا، بہت کامیاب ہے۔ اس داستان کا موضوع چلکاش نامی ایک ترش رُو اور نڈر خفیہ فروش اور اس نوجوان طامع لڑکے کا تقابل ہے جسے چلکاش اپنے خطرناک اور مجرمانہ پیشے کا شریک بناتا ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ نہایت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ چلکاش کا کردار قابلِ تعریف صفائی اور بہترین فن کاری سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے دو اور افسانے "مالوا" اور "میرا ہم سفر" ہیں۔

اول الذکر افسانے میں مالوا عورت کے بھیس میں دوسرا چلکاش ہے۔ موخر الذکر داستان کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے غیر فانی حیثیت رکھتی ہے۔ "میرا ہم سفر" میں پرنس شاکرو جس کے ہمراہ داستان گو اوڈیسا سے ٹفلس تک پیدل سفر کرتا ہے، کا کردار فی الحقیقت گورکی کی نادر تخلیق ہے۔

شاکرو کے کردار میں مثالیت کا شمہ بھر موجود نہیں، گو یہ صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی صناعانہ ہمدردی صرف اسی کے حق میں ہے۔

ان خصوصیتوں میں سے جو گورکی کی شہرت کا باعث ہوئیں، ایک اس کے نیچر کو بیان کرنے کا خاص انداز ہے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر اس کے افسانوں میں سے چند جملے پیش کرتے ہیں:۔

"لنگرگاہ کے گرد و غبار میں جنوبی آسمان گدلا نظر آتا ہے۔ تاباں سورج سنہری مائل سمندر کو دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے، جیسے اس نے خاکستری نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ سورج کا عکس سمندر کی سطح پر چپوؤں کے تھپیڑوں دخانی کشتیوں اور ترکی جہازوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے نہیں پڑ رہا، جو بندرگاہ پر ہل چلا رہے ہیں یہاں سمندر کی آزاد لہریں سنگین دیواروں میں قید اور ان بھاری وزنوں کے نیچے دبی ہوئی، جو ان کے سینے کو کچلتے ہیں۔ جھاگ بن کر اپنی چھاتی کوٹتی ہیں، اور شکایت کرتی ہیں"۔

از چلکاش

"ہم نے الاؤ روشن کیا اور اس کے قریب لیٹ گئے۔ رات بہت شاندار تھی۔ گہرے سبز سمندر کی لہریں نیچے چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہمارے اوپر نیلگوں آسمان کی پرشکوہ خاموشی چھائی تھی۔ ہمارے گرد و پیش عطر بیز درخت تھے۔ جھاڑیاں بڑی آہستگی سے جھوم رہی تھیں۔ چاند بلند ہو رہا تھا جس کے ساتھ درختوں کے نازک سایوں کا جھرمٹ پتھروں پر رینگ رہا تھا۔ قریب ہی کوئی خوش گلو پرندہ راگ الاپنے

ا چیخوف نے بھی گورکی کی اس خصوصیت کا تذکرہ اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اس نے گورکی کو لکھا تھا۔

میں مصروف تھا۔ اس کی نقرئی آواز فضا میں جو لہروں کے تھپیڑوں کی دھیمی اور دل نواز صدا سے معمور تھی، آہستہ آہستہ حل ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ . . . آگ تیزی سے جلنے لگی۔ الاؤ سے شعلے سرخ اور زرد پھولوں کا ایک گلدستہ نظر آتے تھے۔ کانپتے ہوئے سائے ہمارے آس پاس رقص کر رہے تھے۔"

از میرا ہم سفر

"موسمِ بہار کے سورج کی کرنیں بادلوں سے چھَن چھَن کر پانی کی سطح پر زرنگاری کا کام کر رہی تھیں۔ ہوا کا جھونکا آنے پر نیچر انتہائی مسرت میں مسکرا دی۔ بادلوں میں چھپا ہوا نیلگوں آسمان بھی مسکرا رہا تھا۔ بادلوں کا گروہ جو فضا میں غیر متحرک لٹک رہا تھا، چمکیلے پانی کے اوپر کسی گہری سوچ میں غرق تھا گویا وہ آتش سورج سے بچنے کے لئے کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ اس شوخ رنگ اور پُر از مسرت سورج سے جو طوفان کے ان نشانوں کا دشمن ہے۔"

از کلک پر

گورکی کے بیشتر افسانوں میں اس قسم کی تفصیلات عام ہیں "مالوا" کا افتتاحیہ جملہ جو صرف دو لفظوں یعنی "سمندر ہنس رہا تھا" پر مشتمل ہے۔ اس کے طرز بیان کی مخصوص مثال ہے۔

۱۸۹۷ء میں گورکی کی حقیقت نگاری اس کی رومانیت پر غالب آگئی۔

"جو کبھی انسان تھے" اس پر شاہد ہے۔

"اس افسانے اور ہر اس افسانے میں جو گورکی نے ۱۸۹۷ء کے بعد قلم بند کیا، ایک ایسی خصوصیت نمایاں طور پر ظاہر ہے جو اس کی ادبی شہرت کے زوال کا باعث

ہے۔ یہ خصوصیت فلسفیانہ گفتگوؤں سے حد سے زیادہ بڑھا ہوا پیار ہے۔ جب تک اس نے اس عنصر سے پرہیز کیا، وہ اپنی تعمیری قوت کا ثبوت دیتا رہا، جو دیگر افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہے۔

گورکی کا وہ افسانہ جو اس کے ان تمام ادبی عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ ہے"۔ جو اس نے ۱۸۹۹ء میں لکھا۔

(پرنس۔ ڈی۔ ایس۔ میرسکی)

اس افسانے کا افتتاحی منظر بسکٹ بنانے کا ایک تنگ و تار کارخانہ ہے، جہاں یہ چھبیس مزدور روزانہ چودہ گھنٹے لگاتار مشقت کرتے ہیں۔ گورکی اس افسانے کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح شروع کرتا ہے:۔

ہم تعداد میں چھبیس تھے۔ چھبیس متحرک مشینیں۔ ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید۔ جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں کے لئے میدہ تیار کرتے۔

ہماری زنداں نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں، جن کا نصف حصہ آہنی چادر سے ڈھکا تھا اور شیشے گرد و غبار سے اُٹے ہوئے تھے۔ اینٹوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتی تھی۔ اس لئے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ ہمارے آقا نے کھڑکیوں کا نصف حصہ اس لئے بند کرا دیا تھا کہ ہمارے ہاتھ اس کی روٹی سے ایک لقمہ بھی غریبوں کے دینے کے لئے باہر نہ نکل سکیں یا ہم ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

اس سنگین زندان کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑی کے جالے سے اُٹی ہوئی تھی، ہم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس چار دیواری میں جو کیچڑ

اور میدے کے خمیر سے بھری ہوئی تھی، ہماری زندگی، غم و فکر کی زندگی تھی۔"

اس افسانے کے متعلق کچھ اور لکھنے سے پیشتر ہم گورکی کے پیش کردہ کرداروں پر مختصر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ گورکی اپنی بیشتر تصانیف میں مزدوروں اور غربت زدہ کسانوں کو انسانوں[1] کی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ یہ چیز یورپی ذہن کے لئے جو خوشگوار ماحول کا عادی ہے، نئی اور عجیب حیثیت رکھتی ہو تو کوئی اچنبھا نہیں ہے۔ مگر ہندوستان جو روس کے اس زمانے کی فضا سے صدگونہ مماثلت رکھتا ہے ان کرداروں کو جو کبھی انسان تھے بخوبی سمجھتا ہے۔

جب گورکی "چھبیس متحرک مشینیں" لکھتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ ہم فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ لفظ ناکامی، حزن و ملال اور تاریک زندگی کا مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔

گورکی انسان کو اس شکل میں پیش نظر رکھتا ہے جیسا کہ وہ ہے۔ اس کے کردار بھوک کو "معاشی دباؤ" نہیں کہتے۔ وہ اسے صرف بھوک کہتے ہیں۔ وہ امراء کو "سرمایہ دارانہ عناصر کا اجتماع" نہیں کہیں گے۔ وہ انہیں صرف "امراء" کا نام دیں گے۔

گورکی کی یہ سادہ بیانی اور صاف گوئی اس کی تمام تصانیف میں موجود ہے۔ "چھبیس متحرک مشینیں" لکھتے وقت غالباً گورکی کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں ان مظلوم مزدوروں کی صحیح تصویر ناظر کے سامنے پیش کرے اور یہ حقیقت ہے کہ "چھبیس متحرک مشینیں" پڑھتے وقت ان مزدوروں کی لامتناہی محنت و مشقت اور بے بسی کی ایک صاف تصویر کھنچ جاتی ہے۔

---

[1] ایک انگریز نقاد نے گورکی پر نقد و تبصرہ کرتے وقت یہ کہا ہے۔

اس افسانے میں چھبیس زشت رُو غلیظ مزدوروں کی ایک داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ سب ایک حسین لڑکی ٹینیا کی محبت میں گرفتار ہیں۔ جو ہر روز ان سے بسکٹ لینے کے لئے آتی ہے۔ اس لڑکی کا معصوم حسن ہی ایک ایسی شعاع ہے، جس سے ان کی تاریک زندگی آشنا ہے۔

ان لوگوں کو جو سب کے سب غلیظ اور ان میں سے اکثر مریض ہیں، صرف ایک چیز منسلک کئے ہوتی ہے۔ یعنی ٹینیا سے ان کی جذباتی محبت۔ گورکی بڑے صاف انداز میں ان کی اس اجتماعی محبت کی تشریح کرتا ہے۔

"ہم صنفِ نازک کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات ہماری گفتگو ناگوار ہو جایا کرتی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ہمارے خیالات عورتوں کے متعلق بہت بُرے تھے بلکہ وہ صنف جس کے متعلق ہم اظہارِ خیالات کرتے تھے، عورت کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ مگر ٹینیا کی شان میں ہمارے منہ سے کبھی گستاخ کلمہ نکلنے نہ پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمارے پاس بہت کم ٹھیرتی تھی۔ وہ آسمان سے ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح روشنی دکھلا کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جایا کرتی تھی۔ یا اس کی وجہ اُس کا حُسن ہو۔ کیونکہ ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت پیدا کر دیتی ہے، خواہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی وجہ تھی۔ گو زندان نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا مگر ہم پھر بھی انسان تھے اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی کسی کی پرستش کئے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ ہمارے لئے اس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی شے نہ تھی۔ اس لئے کہ بیسیوں انسانوں میں جو اس عمارت میں رہتے تھے، ایک صرف

وہی تھی جو ہماری پرواہ کیا کرتی تھی، سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

ہر روز اس کے لیے بسکٹ مہیا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ ایک نذرانہ ہوتا جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربان گاہ پر چڑھاتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مقدس فرض ہو گئی، جس کے ساتھ ہمارا اور اس کا رشتہ بھی باہم مضبوط ہو گیا۔ ہم ٹینیا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے۔ یہی کہ وہ سردی میں گرم کپڑے استعمال کیا کرے۔ اور سیڑھیوں پہ سے احتیاط کے ساتھ گزرا کرے۔"

مندرجہ بالا سطور سے مزدوروں کے کردار کا بچپن نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اس بچپن سے گورکی کو یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ چھبیس غیر تربیت یافتہ مزدور کس غیر معمولی اخلاص اور سادگی سے ٹینیا کی محبت میں گرفتار تھے۔ در اصل ان مزدوروں کو اپنی تاریک زندگی میں صرف ایک ہی شعاع نظر آئی جس کا دامن انہوں نے پکڑ لیا۔ گو یہ لوگ غلیظ وحشی جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان کے کھردرے قلوب پر ٹینیا کا وجود پورا اثر کرتا ہے، جسے وہ حقیقی حسن تصور کرتے ہیں۔

یہ لوگ خود اپنی غربت اور پُر از مصائب زندگی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ان کا قصور نہیں کہ وہ مذہب اور آئیڈیل نہیں رکھتے۔ وہ امید اور خواہش زندگی سے ناآشنا ہیں۔

"روسی مجلسی دائرے میں آراء و افکار کی نااستواری کا وجود جیسا کہ گورکی خود کہتا ہے "مثالیت سے غفلت برتنے کا نتیجہ ہے"

ٹینیا چھبیس مزدوروں کی نظر میں ایک فرشتہ ہے۔ اس کی عصمت پاکیزگی اور نیکی نہ صرف ان کی گفتگوؤں کا موضوع ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ان مزدوروں کی زندگی کو

نئے معانی بخشتی ہے۔

بڑے ڈرامائی اور بے رحم انداز میں گورکی اپنے پیش نظر مقصد کو رفتہ رفتہ ظاہر کرتا ہے۔ چھبیس پجاری اپنی دیوی کی عصمت کا امتحان لیتے ہیں۔

ایک سپاہی جو اس کارخانے میں ان کی بہ نسبت اچھے کام پر نوکر ہے، ان سے دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ٹینیا کو ہتھے چڑھا لے گا۔ مزدور سپاہی سے شرط تو لگا بیٹھتے ہیں۔ مگر وہ ایک بے قراری مول لے لیتے ہیں۔

اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم شیطان سے بازی لگا رہے ہیں۔ جب ہم نے کیک بنانے والے سے سنا کہ سپاہی نے ٹینیا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں سخت رنج پہنچا۔ ہم اس رنج کو مٹانے کے لئے اس قدر محو تھے کہ ہمیں یہ معلوم تک نہ ہوا کہ آقا نے ہماری بے چینی اور اضطراب سے فائدہ اٹھا کر میدے میں تیس سیر کا اضافہ کر دیا ہے۔"

وہ حد درجہ مضطرب اور اس بات پر متاسف تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ ٹینیا کی عصمت کا امتحان کرنا چاہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اس روز کے منتظر تھے جب انہیں یہ معلوم ہو جانے والا تھا کہ وہ برتن جس میں انہوں نے اپنے دل رکھے ہوئے ہیں، کتنا صاف اور بے لوث ہے۔

بدقسمتی سے ٹینیا باعصمت ثابت نہیں ہوتی۔ اور وہ سپاہی کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ یہ داستان خوش گوار نہیں ہے۔ لیکن گورکی کے قلم نے اسے اس غیر جانبدارانہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ ہولناک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

"چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" شعریت کی اس قدر زوردار رَو سے لبریز

ہے۔ اس میں آزادی اور حسن کا اتنا معتدل ایمان ویقین ہے۔ اس کے علاوہ یہ داستان اس قدر صحتِ فن کاری سے بیان کی گئی ہے کہ ہم اسے گورکی کا شاہکار تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ افسانہ اسے بلاشک وشبہ ہمارے بلند مرتبت کلاسکس کی صفِ اولین میں جگہ دلواتا ہے:

"پرنس۔ ڈی۔ ایس۔ میرسکی"

گورکی اپنے افسانوں میں ارادتاً سوسائٹی کے پائین طبقے کو زیرِ قلم رکھتا ہے۔ اس کے کردار بالعموم اپنے مقاصد میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جب وہ ایک آوارہ زندگی بسر کر رہا تھا، اسے اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

اس کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ چیز ہرگز فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گورکی کی پرورش آغوشِ غربت میں ہوئی اور یہ کہ اسے پیٹ پالنے کی خاطر ایک طویل مدت تک ذلیل سے ذلیل مشقت کرنا پڑی۔

اس شخص سے بربطِ فکر سے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک تاریک فضا میں اور غیر تربیت یافتہ درشت مزدوروں میں بسر کیا، کس قسم کے نغمے بلند ہو سکتے ہیں۔ گورکی ہمیں وہی کچھ پیش کرتا ہے جو اس کے حساس دل نے محسوس کیا اور جو اس کی چشمِ فکر نے مشاہدہ کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا اندازِ بیان نہایت بیباک اور ظالمانہ ہے۔

جس طرح بائرن کا ترنم غیر عشقانہ آتشیں اور آزاد ہے۔ ٹھیک اسی طرح گورکی کی آوازِ بلند دیوانہ وار اور بے لگام ہے۔ جب وہ برہنہ پا د گرسنہ شکم لوگوں

کا گیت الاپتا ہے جو اپنی کاہلی پر نازاں ہیں۔ جو مفلس تو ہیں مگر نڈر۔ جو اپنی پُر از مصائب زندگی سے خوش ہیں۔ گو مسرت کے وقت مغموم۔

گورکی کی صدا چیخوف کی شائستہ نرم و نازک اور منجھی ہوئی آواز نہیں۔ نہ وہ معلّمِ اخلاق تالسٹائی کی کمزور زاہدانہ صدا ہے۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی گرج ہے۔ چمکتی ہوئی بجلی کی کڑک ہے۔

ابتدائی قوت میں یہ آواز کسی ایسے حساس انسان کی دل میں اتر جانے والی چیخ ہے جس نے زندگی کے مصائب و آلام سہہ کر ہی دنیا کے منہ پہ نہایت بے پروائی سے تھوک دی ہو۔

وہ دنیا جو گورکی اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے، ہماری دیکھی بھالی نہیں ہے اور وہ کردار جو اس کے افسانوں کے محرک ہیں، ہم ان سے ناآشنا ہیں۔ مگر اس کے باوجود کہ ہم اس سرزمین کو جغرافی حالات کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ گورکی ہمیں ان گہرائیوں تک لے جاتا ہے۔ اور روسی زندگی کی ایک ایسی قلمی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، جس سے عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

گورکی کے افسانوں کے کردار عموماً کسان یا مزدور جماعت سے متعلق ہوتے ہیں۔

وہ ایسے ناکارہ انسان ہیں جو دنیا کی شاہراہوں پر بھٹک رہے ہوں۔ ان کے ذہن غلاموں ایسے ذہن ہیں۔ کسی آقا یا زندگی کے ایسے قانون کی تلاش جس کی وہ آنکھیں بند کرکے اطاعت کر سکیں، ان کا واحد منتہائے مقصد ہوتا ہے۔ ان میں تشخص اور کیریکٹر کی استواری کا فقدان ہے۔ اگر ان میں الیالینیٹ ایسی ہوش مندی اصد

ذہانت اور اپنی کوششوں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہے تو ان میں نظام خودی کا عنصر بہت قلیل مقدار میں ہوتا ہے جو انجام کار ان کی زندگی کو مغموم بنا دیتا ہے۔ ان تمام امور کے ہوتے ہوئے ان کا خالق یعنی گورکی اُن پر ایک غیر معمولی اعتقاد رکھتا ہے۔

مس گروسکاٹ

گورکی کے پروردہ غربت ہیرو تشخص سے بیگانہ ہوں۔ وہ زندگی کی شاہراہوں پر بھٹکے ہوئے ناکارہ انسان ہوں۔ مگر ان میں ایک نمایاں خصوصیت ضرور ہے، جس کی مثال روسی ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ وہ دوستوفسکی اور تورگنیف کے پیش کردہ کرداروں کی طرح اپنی تیرہ بختی کا گلہ نہیں کرتے۔ "روسی ہیرو" گورکی اپنے کسی افسانے میں لکھتا ہے، ہمیشہ جاہل اور سادہ لوح ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کسی ایسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ملول رہتا ہے۔"
ان لوگوں کی زندگی جہالت کا مرقع ہے۔ انہوں نے غلامی کی فضا میں پرورش پائی ہے لیکن وہ یقیناً آزادی کی لذت محسوس کرتے ہیں۔

"مجھے اپنی بے خانماں اور آوارہ زندگی پسند ہے۔ بیشتر اوقات سردی نے میری رگوں میں خون منجمد کیا ہے۔ میں نے فاقے کھینچے ہیں۔ لیکن آزادی عظیم الشان ہے۔" یہ ہیں وہ لفظ جو ہم گورکی کے ایک کردار کے منہ سے سنتے ہیں۔

دیہات اور شہر کی پُرسکون زندگی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ گورکی کے

۱؎ تھرڈ مین کا ہیرو

تقریباً ہر افسانے میں ہم اس کے خانہ بدوش اور حریت پسند کردار کو کسی آئیڈیل کا دامن تھامے دیکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت بلاشبہ گورکی کا اپنا عکس ہے۔

اس کے کردار عموماً سوسائٹی کے مصنوعی نظام سے رہائی حاصل کر کے نیچر کے وسیع کارخانے میں بھاگ آتے ہیں۔ جہاں انہیں سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر نصیب ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم نیچر کو اس کے افکار کے دوش بدوش اور اس کے کرداروں کی انسانی حیات میں موجود دیکھتے ہیں۔

انسان اور نیچر میں صوفیانہ قربت گورکی کی ہر تصنیف میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اگر ہم فرداً فرداً اس کے ہر افسانے اور ہر ناول سے اس عنصر کی مثالیں پیش کرنا چاہیں تو اس کے لئے یقیناً ایک علیحدہ مفصّل مقالے کی ضرورت ہوگی۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

"مالوا" نامی افسانے میں ہم ایک ایسی لڑکی دیکھتے ہیں جو زندگی سے نہ صرف نفرت کا اظہار کرتی ہے بلکہ اس سے سخت اُکتا گئی ہے۔ وہ نیچر کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہے۔ وہ تمام مرد جو اس سے ملتے ہیں اس کی دلچسپی کا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔

اس افسانے کا ایک کردار ان الفاظ میں شہری زندگی سے اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

"لوگوں نے شہر اور گھر تعمیر کر رکھے ہیں۔ ان میں بھیڑوں کے گلّے کی طرح بسر اوقات کرتے ہیں۔ زمین کو پلید کرتے ہیں۔ حبس دم ہو رہے ہیں ——— ایک دوسرے کو دبا رہے ہیں ——— عجیب مضحکہ خیز زندگی ہے!"

"میدانوں میں" نامی افسانے میں گورکی کا خانہ بدوش کردار رات کے وقت ننگی زمین پر لیٹا اپنے دوست سے یہ کہتا ہے۔

"یہ زندگی خواہ فاقوں سے لبریز ہے ...... مگر آزاد ہے .... اپنے آقا خود آپ ہو .... اگر اپنا سر بھی کاٹنا چاہو تو کوئی روکنے والا نہیں .... ان دنوں فاقہ کشی نے مجھے سرکش بنا دیا تھا .... مگر میں اب یہاں لیٹا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں .... ستارے میری طرف دیکھ دیکھ کر آنکھیں جھپک رہے ہیں ...... معلوم ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ سٹیپن کچھ فکر نہ کرو۔ جاؤ دنیا کی سیاحت کرو۔ مگر دیکھو کسی کی غلامی قبول نہ کرنا! ——— دل کس قدر مسرور ہے!"

گورکی کے خانہ بدوش کردار با خلاص اور بے ریا ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے وہی کچھ نکالتے ہیں جیسے وہ اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ ان میں تہذیب یافتہ افراد ایسی بناوٹ اور مداہنت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو اس شکل میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جیسی وہ اصلاً ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ ظلم کرنے پر بھی اتر آتے ہیں۔ مگر کبھی کبھار۔

ایک اور افسانے میں ہم سوسائٹی کا ایک ایسا کردار دیکھتے ہیں جو کسی تاجر کو قتل کرنے جا رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ایک لڑکی کو دریا میں ڈوبتے دیکھتا ہے مگر اسے صرف اس لئے نہیں بچاتا کہ اسے تاجر کو قتل کرنا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس چالکاش عادی چور شرابی اور آوارہ مزاج اپنے ساتھی گیوریلا سے جو ایک کمزور دل دیہاتی ہے۔ نہایت رحم دلی اور فیاضی کا ثبوت

پیش کرتا ہے۔ اسے وہ تمام روپیہ دے دیتا ہے جو اس نے چوری سے پیدا کیا ہوتا ہے۔

ہم گورکی کے افسانوی کرداروں کی نوعیت پر مختصر تبصرہ کر چکے ہیں۔ آگے چل کر ہم اس کے طویل افسانوں (ناولوں) کے کرداروں پر اس روشنی میں تبصرہ کریں گے۔ گزشتہ اوراق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ گورکی نے فلسفیانہ گفتگوؤں کو اپنے افسانوں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ جس سے اس کی ادبی شہرت کم ہونے لگی۔

۱۸۹۸ء میں اس نے ایک افسانہ بعنوان "شریر لڑکی" سپردِ قلم کیا۔ اس میں اس نے تعلیم یافتہ لوگوں کی عکاسی کرنا چاہی۔ مگر اس میں ناکام رہا۔

ہمیں گورکی کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے صرف ایسا انشا پرداز بننا ناپسند تھا جس کا خمیر طبقۂ ادنی سے اٹھایا گیا۔ وہ فی الحقیقت لیڈر اور معلّم کی حیثیت میں خود کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس خواہش کی جھلکیاں ان ڈراموں اور ناولوں میں صاف طور پر نمایاں ہیں جو اس نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیانی زمانے میں تصنیف کئے۔ اس زمانے کے قابل ذکر ناول یہ ہیں:-

۱۔ فوما گورڈیوف

۲۔ وہ تینوں

۳۔ ماتا

۴۔ ایک

"فوما گورڈیوف" عظیم الشان تصنیف ہے۔ اس میں نہ صرف روس کی تمام

پہنائیاں مرکوز ہیں بلکہ وسعتِ زندگی بھی مستور ہے۔

جس طرح کارخانوں اور منڈیوں کی اس دنیا میں اور عبور و مرور اور تجارت کے اس زمانہ میں ہر جگہ ایک غضب ناک لوگ اٹھتے ہیں جو سازِ حیات کے تاروں میں اس کی صحیح ترتیب کی جستجو کرتے ہیں اور زندگی کی حقیقی تپش سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح "فوما گورڈیوف" روس کی سرخ فضا میں اُبھرتا ہے اور اسی سوال کا جواب چاہتا ہے۔

اس کتاب میں روسی تجزیۂ خودی اور دقیق النظری گورکی ہی کی پیدا کردہ ہے۔ اپنے دیگر روسی بھائیوں کی طرح اس کے افکار بھی غیرت مند اور پُر از جوش احتجاج کے حامل ہیں۔ مگر اس احتجاج سے ایک مقصد وابستہ ہے۔ وہ صرف اس لئے اپنا قلم اٹھاتا ہے کہ اسے گوشِ انسانیت تک کچھ پہنچانا مقصود ہے ——— اس کے مضطرب بربطِ فکر سے نرم و نازک راگنیاں بلند نہیں ہوتیں وہ اپنے ساز سے صرف حقیقت کا نغمہ نکالتا ہے ——— دل سوز، خونناک اور بے باک!

یہ غلطی ہوگی اگر ہم خیال کریں کہ امراء کی جماعت اس "خوف ذوالنسان" فوما گورڈیوف کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے ——— ان کی موٹی کھالوں پر گورڈیوف کی چھوئی ہوئی سوئیاں کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔

انہیں یہ امر نہایت تعجب خیز معلوم ہوگا کہ فوما گورڈیوف نے جسے دولت کی فراوانی اور صحت کی تازگی میسر تھی، اپنے ہم اقتدار لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا کیوں پسند نہ کیا ——— ان لوگوں کی طرح جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ

کرسیوں کے ساتھ چپک کر، تبادلے کے بدلتے ہوئے سودوں کی دھن میں مست اور اپنے حریف ہم پیشہ تاجروں کو کچل ڈالنے کی تدابیر سوچنے میں محو رہتے ہیں۔

فوما گوردیوف اسی قسم کے ایک تاجر کا لڑکا ہے مگر اس میں بیداری کی چنگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گردو پیش کی دنیا سے جو تجارت کی ہاؤ ہو سے پُر ہوتی ہے، سخت متنفر ہو جاتا ہے۔

"آہ" فوما نہایت گستاخ لہجے میں دریافت کرتا ہے۔ اگر زر پرستی کے ان تمام برسوں کا انجام مرجانا اور فنا ہو جاتا ہے تو فرمایئے سیم و زر کی اس ہوس سے فائدہ؟

جس سرمایہ دار سے فوما نے یہ گستاخانہ" سوال کیا، وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ خود میاکن (فوما کا روحانی باپ) بھی اپنے روحانی بیٹے کو نہ سمجھ سکا۔

"آپ فخر کیوں کرتے ہیں"۔ ایک روز فوما، میاکن پر برس پڑتا ہے" آخر آپ اترا کس چیز پہ رہے ہیں؟ —— آپ کا لڑکا بتایئے وہ کہاں ہے؟ —— آپ کی لڑکی، فرمایئے وہ کیا ہوئی؟ —— زندگی کے ناظم صاحب، مانا کہ آپ چالاک ہیں۔ آپ کے علم میں سبھی کچھ ہے۔ مگر ذرا یہ تو بتایئے۔ آپ کس لئے جیتے ہیں؟ روپیہ کیوں اکٹھا کرتے ہیں؟ —— کیا آپ کو مرنا نہیں ہے؟ —— تو پھر؟

میاکن کے پاس ان تمام سوالوں کا جواب نہیں ہوتا۔ مگر وہ پھر بھی اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔

فوما گورڈیوف کے سوالات غیر متوقع اور تیز ہوتے ہیں۔ یہ چیز اس کے مضطرب قلب کی آئینہ دار ہے۔ دراصل وہ اپنے دل میں ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے، جب وہ اپنے ماحول میں ہر چیز کو انسانیت کش پاتا ہے یہ اضطراب یہ بے قراری اس کی زبان پر چند پریشان مگر آتشیں الفاظ لاتی ہے، جو وہ ہر اس شخص کے منہ پر کہہ ڈالتا ہے جو اس سے ہم کلام ہو۔

فوما گورڈیوف اس ماحول سے باغی ہو جاتا ہے۔ جو سرا سر دولت کمانے کی خود غرض خواہشات اور نفس دوستیوں سے لبریز ہے۔ اگناٹ (فوما کا باپ) میاکن (فوما کا روحانی باپ) اور اسی قسم کے دیگر کامیاب تاجروں کے طلائی سکوں کی تعریف میں گائے ہوئے گیت اس پر اثر انداز نہیں ہوتے ——— یہ لوگ کیوں گائیں، جب پاس ہی دوسرے رو رہے ہیں؟ ——— یہ زندگی ایک کابوس ہے! ——— خواب جس کا کوئی مطلب نہیں! میں پوچھتا ہوں اس کے معنی کیا ہیں؟ ——— اس کے نیچے کیا ہے؟"

اگناٹ، فوما کو جو ابھی کم سن لڑکا ہوتا ہے، سمجھاتا ہے:۔

"اگر تم غربا کو ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتے ہو تو یہ ایک نہایت مبارک جذبہ ہے۔ لیکن تمہیں اپنی اس ہمدردی کے ساتھ انصاف برتنا چاہیئے اور اولاً تمہارے پیش نظر یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شخص جسے تم ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ شخص اہلیتوں اور طاقت کا مالک ہے اور تمہیں اس سے فائدہ اٹھانے کی امید ہو سکتی ہے تو تم بخوشی اس کی مدد کرو۔ لیکن اگر وہ کمزور ہو۔ کام کرنے کے ناقابل ہے تو اس پر تھوک دو اور اپنے مطلب سے غرض

رکھو۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ شخص جو ہر چیز کے متعلق شکوے شکایت کرتا رہے اور ہر وقت اپنا رونا روتا رہے، ایک پھوٹی کوڑی کا حق دار نہیں ہے ـــــ ایسے شخص کی مدد کرنا بے کار ہے!"

باپ کی ان زرگرانہ اور تاجرانہ نصیحتوں کے باوجود فوما اپنی دُھن میں مست رہا ـــــــــ ان پند و نصائح نے احساسِ بیداری کی اس چنگاری کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ جو اس کے نوخیز دماغ میں سُلگ رہی تھی۔

لیکن فوما کا روحانی باپ الگ اپنا زاہدانہ راگ الاپتا ہے۔ وہ یہ وعظ کرتا ہے:-

"میرے عزیز، معلوم ہے بھکاری کیا ہوتا ہے؟ ـــــــ بھکاری وہ انسان ہے جسے قسمت مجبور کرتی ہے کہ وہ ہمیں حضرت عیسیٰؑ کی یاد دلائے ـــــ وہ عیسیٰ کا بھائی ہے ـــــــــ خدا کا گجر جو ہمارے خوابیدہ ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے فضا میں گونجتا ہے۔ وہ کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر گاتا ہے "عیسیٰ کی راہ میں ......" اس صدا سے وہ ہمیں مقدس پیغمبر کے احکام کی یاد دہانی کراتا ہے کہ ہمیں غربا کی مدد کرنی چاہیئے۔ مگر مقامِ تاسف ہے کہ فی زمانہ لوگ اپنی زندگی کچھ ایسے طریق پر گزار رہے ہیں کہ اس کی تعمیل محال ہے ...... اب ہم ان تمام فقیروں اور گداگروں کو ایسی چار دیواری میں قید کر دینا چاہتے ہیں کہ وہاں سے نکل کر وہ ہمارے ضمیر کو نیک کام کے لئے بیدار نہ کر سکیں۔"

فوما کے دماغ پر ان تمام گفتگوؤں کا کچھ اثر نہیں ہوتا ـــــــ اس کے منہ

سے نکلی ہوئی چیخ ان خشک و تر نصیحتوں کی طالب نہیں ہوتی۔ فوما روشنی چاہتا ہے اور چونکہ روشنی ڈھونڈنے کی یہ خواہش اسے ایک لمحہ چین نہیں لینے دیتی اس لئے وہ اپنے لغاوت سے بھرے ہوئے سینے کو لے کر اٹھتا ہے۔ اور زندگی کے حقیقی معانی کی جستجو کرتا ہے۔

"اس کے تمام خیالات اس غلیظ جماعت پر مرکوز ہو گئے۔ جو صبح سے شام تک گدھوں ایسی مشقت کرتی تھی —— یہ منظر اس کے لئے سخت تعجب افزا تھا —— اسے حیرت تھی کہ وہ زندہ کیوں ہیں؟ انہیں اپنے تاریک ماحول میں ایسی کون سی شعاع نظر آتی ہے جس کے سہارے وہ جی رہے ہیں؟ —— ان کا کام صرف اپنے غلیظ فرائض کو سرانجام دینا اور کڑی سے کڑی مشقت کرنا تھا۔ ان کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے ہوتے۔ وہ سوکھی روٹی پر گزر اوقات کرتے اور ان میں سے اکثر شراب کے عادی ہوتے —— اگر کسی کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی ہوتی تو اس ضعیف العمری کے باوجود وہ نوجوانوں کے دوش بدوش مشقت میں مصروف نظر آتا —— یہ تمام مزدور فوما کی نظر میں کیڑوں کا ایک ڈھیر تھا جو زمین پر کچھ کھانے کے لئے رینگ رہے ہوں۔"

رفتہ رفتہ فوما زندگی کا ایک مجسم استفہام بن جاتا ہے۔ وہ زندہ رہنے سے منکر ہو جاتا ہے۔ جب تک اسے زندگی کا اصل مطلب سمجھ نہ آ جائے۔

"میں کیوں زندہ رہوں۔ جب مجھے پتا ہی نہیں ہے کہ اس زندگی کا مطلب کیا ہے؟" وہ ایک بار میاکن سے دفعتہً سوال کرتا ہے جو اسے اپنے مرحوم باپ

کا کاروبار سنبھالنے کے لئے کہہ رہا ہوتا ہے۔

دراصل فوما کی عقل اس عقدے کو حل کرنے سے قاصر ہوتی ہے کہ لوگ صرف اس کی واحد ذات کے لئے کیوں مشقت برداشت کریں اور اس کے اور اس کی دولت کے غلام بنیں؟

"انسان کے لئے مشقت ہی میں تمام نعمتیں نہیں دھری ہیں —— کام کے ساتھ اس عذر کو وابستہ کرنا غلطی ہے۔ بعض افراد ایسے بھی ہیں۔ جن کے ہاتھ محنت و مشقت سے ناآشنا ہیں لیکن بایں ہمہ وہ نہایت شاندار زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ؟ —— میرے پاس پُر از عیش زندگی بسر کرنے کا کیا عذر ہے؟ وہ لوگ جو دوسروں سے اپنے احکام منواتے ہیں، آرام دہ زندگی بسر کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ —— وہ کس لئے زندہ رہتے ہیں؟ —— میرا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ زندگی شروع کرنے سے پیشتر قطعی طور پر معلوم کرلے کہ وہ کس مقصد کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے —— کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی کا مقصد مشقت، روپیہ کی فراہمی، مکانوں کی تعمیر، بچوں کا پیدا کرنا اور مرجانا ہے؟ —— ہرگز نہیں —— مقصدِ حیات کچھ اور ہے —— —— انسان پیدا ہوتا ہے۔ کچھ مدت کے لئے زندہ رہتا ہے اور مرجاتا ہے —— کتنی مضحکہ خیز بات ہے! ہم سب کو یہ سوچنا سزاوار ہے کہ زندگی کس لئے عطا کی گئی ہے —— خدا کی قسم —— اس کا صحیح جواب سوچنا ہر انسان کا فرض ہے۔ ہماری یہ زندگی فضول ہے۔ لالعینی ہے —— بیہودہ ہے۔ بکواس ہے! کچھ امیر ہیں جن کے پاس اس قدر دولت ہے کہ وہ ہزاروں

انسانوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں ——— وہ بالکل بے یار و مددگار ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو تمام عمر مشقت میں اپنی کمریں دوہری کر لیتے ہیں۔ مگر ان کی جیبیں تانبے کے ایک پیسے سے نا آشنا رہتی ہیں!!!"

نوما کو جس طرف روشنی کی مدھم شعاع بھی نظر آتی ہے، وہ ادھر دوڑ پڑتا ہے اسے معلوم ہے کہ ہر چیز سقیم ہے۔ مگر وہ اس سقم کو دُور کرنے کی قدرت خود میں نہیں پاتا۔ وہ صرف حملہ کرنا اور تباہ کرنا جانتا ہے۔ وہ تاجروں کی بہرہ مند ہستیوں سے سوال کرتا ہے:۔

"یہ زندگی تمہاری تخلیق کردہ نہیں ——— تم لوگوں نے اس دنیا کو گندگی کا ایک عمیق گڑھا بنا رکھا ہے! تمہارے افعال غلاظت افشانی کہتے ہیں۔ کیا تم اپنے پہلو میں ضمیر رکھتے ہو؟ ——— کیا خدا کی یاد تمہارے دلوں میں موجود ہے؟ ——— پانچ دمڑی کا پیسہ ——— یہ ہے تمہارا معبود!!"

اور پھر عیسیٰ کی روحانی آواز کی طرح وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

"اے زر دارو! ——— ان قہروں پر آنسو بہاؤ جو عنقریب تم پر برپا ہونے والے ہیں ——— خون چوسنے والے لٹیرو! تم دوسروں کی طاقت کے بل بوتے پر جیتے ہو۔ تم مستعار ہاتھوں سے کام کرتے ہو ——— تم تباہ ہو جاؤ گے ——— تمہیں ہر چیز کا حساب دینا ہوگا ——— آنسو کے ننھے قطرے تک کا!"

وہ اپنے گرد و پیش کی تاریکی سے متعجب ہو کر سوال کرتا ہے اور سوال کئے جاتا ہے کہ اسے اس اسرار کا کوئی حل مل سکے مگر بے سود۔ چنانچہ وہ زندگی کی

بھول بھلیوں میں ٹھوکریں کھاتا، موت کا ناچ ناچتا، کسی موہوم چیز کی تلاش میں سرگرداں اور زندگی کے صحیح مقصد کی جستجو میں حیران رہتا ہے اور انجام کار پاگل ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب دلکش نہیں ہے، مگر عبارت ہے زندگی کے استفہام سے ـــــــ عمومی زندگی سے نہیں بلکہ آج کل کی معاشری زندگی سے ـــــــ یہ کتاب پُر لطف نہیں۔ اس لئے کہ موجودہ معاشرت پُر لطف نہیں ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری دنیا کی ابلہ فریبیوں اور دروغ کاریوں سے آشنا ہو کر زندگی سے متنفر ہو جاتا ہے ـــــــ مگر بایں ہمہ یہ تصنیف صحت بخش ہے اس کے اوراق میں معاشری مرض کی ایسی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے اور معائب کا تار و پود اس بے دردی سے بکھیرا گیا ہے کہ اس کا وجود سوائے انسانی فلاح کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد گورکی کی جوئے فکر ایک تند و تیز سمندر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اب دنیا کا نہایت متانت سے مطالعہ کرنے کے بعد نظامِ حیات کی پہنائیوں تک پہنچتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقاصد کی تخلیق و تولید کرے۔

ان کتابوں میں جو گورکی نے اس زمانے میں سپردِ قلم کیں "ماں" سب سے مشہور ہے۔ یہ کتاب جو روسی انقلاب کے زیر اثر لکھی گئی۔ انقلابی تحریک کی نہایت واضح تصاویر پیش کرتی ہے۔ ہم یہاں اس پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں:۔

بیسویں صدی کے آخری نصف میں روس کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔

جس طرح زمین کا یہ خطہ نقشۂ عالم پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ملتِ روس کی جدوجہد آزادی کے خونی واقعات تاریخِ عالم کے بیشتر اوراق گھیرے ہوئے ہیں ...... شائد ہی چشم ایسے لرزہ خیز وقائع و مناظر، دِل ہلا دینے والے ستم و جور، خوفناک جرائم اور جنگِ آزادی میں خون کے ایسے دریا بہتے ہوں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم انسانی زندگی کو ایک ڈرامہ خیال کرتے ہیں تو اس عظیم ڈرامے کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جو روس کی سرخ سٹیج پر کھیلا گیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم بہادری کے ان کارناموں قربانیوں اور شجاعتوں سے متاثر ہوتے ہیں، جو کسی نیک مقصد کے لئے عمل میں لائی گئی ہیں تو روس کی اس آزادی کی کشمکش کا اور کون مدِ مقابل ٹھہر سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم ان جوانمردوں، بزرگوں ولیوں اور شہیدوں کا شمار کرنے کے بعد جنہوں نے قصرِ آزادی کی تعمیر میں حصّہ لیا، کسی قوم کی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں تو ملتِ احمر کے ان برہنہ پا مرد اور عورتوں کی مثال موجود ہے۔ جنہوں نے ایوانِ جمہوریت کی تاسیس کے لئے اپنے خون اور گوشت پوست کو پیش کر دیا۔

روسی غلامی کو اپنی سعادت اور اس دیوی کی پوجا کرنا اپنا فرضِ واحد خیال کرتے تھے۔

وہ اپنے جان و مال کو زار کی ملک سمجھتے تھے۔

بادشاہ کا یہ لفظ لفظِ الٰہی تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فرمانِ ربانی!

زار روسیوں کے لئے خدا کا سایہ اور باپ تھا۔

اس کے ڈھائے ہوئے مظالم عوام کے لئے شہد کی طرح شیریں تھے۔

روسی قوم کسی تاریک خواب میں مدہوش پڑی تھی۔

آخر ش کیا ہوا؟

کورنش بجا لانے والے ہاتھ ستم ورانہ اٹھے اور زار کو اس کے تخت سے نیچے گھسیٹنے لگے۔

ٹھوکریں کھائے ہوئے سینے ابھرے اور زار کی مطلق العنانی کے مقابل آہنی دیوار بن گئے۔

بادشاہ کے ڈھائے ہوئے تلخ مصائب کو عوام نے اسی کے منہ پر تھوکنا شروع کر دیا!

جرسِ انقلاب کا بے پناہ شور بلند ہوا اور قانون کی بلند آہنگی کو ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں سمیٹنا شروع کر دیا!

پھر اسی خوشگوار بادِ نسیم کے راندے ہوئے لوگوں پر جنتِ ارضی کے تمام دروازے نیم وا ہونے لگے۔

ماں اسی زمانے کی ایک داستان ہے، جب جنگِ آزادی کی تڑپ ہر نوجوان کے قلب کو گرمائے ہوئے تھی۔ اس خونچکاں کہانی میں ملت احمر کے مایہ ناز مفکر گورکی نے اس خونی جدوجہد کی اس کامیابی و فن کاری سے تصاویر کھینچی ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ واقعہ ہو بہو رقص کرتا نظر آتا ہے۔

دراصل روس کے یہاں ہر چیز ایک عظیم پیمانے پر ہے۔ اس کے افسانہ نگاروں

کی کہانیاں مینڈک کے پاؤں کی ان بڑی تصاویر کی مانند ہوتی ہیں جو کسی طبی سکول کے کمرے میں پردۂ سیمیں پر دکھلائی جا رہی ہوں۔ ان تصاویر کے ذریعے سے ہم رگوں میں دوڑتا ہوا خون، حرکت کرتی ہوئی نسیں اور پُر اسرار نظامِ عصبی کو جو اس سے پیشتر ہماری آنکھوں سے نہاں تھا، بخوبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح وہ جذبات و حسیات جو اس سے قبل صرف ہماری سماعت تک محدود تھے گوگول کے بیان کردہ واقعات سے ہم پر روشن ہو جاتے ہیں۔

ے خانوں میں خفیہ ملاقاتیں، سرگوشیوں میں تباہ کن سازشوں کی تیاری، رات کی تیاری میں خنجر کی جھلک، منڈلاتے ہوئے جاسوس، مصائب و نوائب کے تیروں سے چھلنی دل، گلی کوچوں میں صدائے انتقام، خون کی ندیاں، غیر مختتم غم واندوہ، لامتناہی سیلِ عشق اور برہنہ یادگرسنہ شکم انسانوں کی خون منجمد کر دینے والی بربادی میں حسرت ناک اموات ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں۔

روسی تند خو بھی ہیں اور نرم مزاج بھی۔ ظالم بھی ہیں اور رحم دل بھی۔ نفرت بھی کرتے ہیں اور پیار بھی۔ جاہل بھی ہیں اور عالم بھی۔ بے وقوف بھی ہیں اور چالاک بھی۔ بادشاہت کے حامی بھی ہیں اور آزادی کے دلدادہ بھی۔ غیر حساس بھی ہیں اور حساس بھی۔ بھولے بھی ہیں اور زمانہ ساز بھی۔ سب سے زیادہ جذباتی بھی ہیں، مگر سب سے زیادہ دبے ہوئے بھی ہیں ان سب کے علاوہ ان میں محسوس کرنے کا مادہ اپنی ہمسایہ قوموں سے کہیں زیادہ ہے اور غالباً یہی ان کے تصویر نما افکار کا سب سے بڑا راز ہے۔ جسے دیکھ کر دنیا آنکھیں جھپکتی رہ گئی ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کا ناقابلِ نقل فن کسی اور دماغ کے بس کا نہیں ہے۔

روس کے ان تمام مفکروں اور ان کی تمام تصانیف میں سے جو انسانی قلوب پر اثر انداز ہوتی ہیں، بلاشک و شبہ گورکی سب سے بڑا مفکر اور اس کا شاہکار "ماں" (مدر) سب سے اعلیٰ تصنیف ہے۔

کوئی دوسرا انشا پرداز یا افسانہ نگار ان واقعات کا صرف ہلکا سا خاکہ کھینچ کر بس کر دیتا جو فضا میں ٹھوس چٹانوں کی مانند کھڑے تھے۔ مگر گورکی کا قلم اس ٹھوس موضوع پر شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی روانی سے چلا ہے اور اس دوران میں اس کی فن کاری میں کسی مقام پر بھی لغزش نہیں آنے پائی۔

زندگی کے اس پیشِ نظر ٹکڑے کو جس پر وہ اپنے لاثانی افسانے کی چار دیواری بلند کرنا چاہتا ہے، وہ کسی ماہر معمار کی طرح ہر پہلو سے بغور دیکھتا ہے تاکہ عمارت میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔

گورکی یہ افسانہ لکھنے سے پیشتر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر حقیر سے حقیر واقعات کو بھی فراہم کر لیتا ہے کہ شاید وہ کسی جگہ کے لئے موزوں ہوں۔ شوربے کی تلخی، مرد کے بوٹ سے چمٹی ہوئی برف، کسی عورت کے بالوں میں اٹکے ہوئے برف کے گالے، لکڑیاں کاٹتا ہوا لکڑہارا، دہقانوں کی بھدّی گفتگو، پیانو کے چھیڑے ہوئے نغمے، سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک، بازاروں میں اڑتی ہوئی کیچڑ اور کارخانوں کے بلند دُود کشوں کا سیاہ دھواں —— ان تمام کم حقیقت اور مُہمل چیزوں کے اجتماع سے اس کا دستِ فکر ایسے مناظر پیش کرتا ہے جو اپنے اندر اثر پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

گورکی کے یہ افکار ہمارے دل و دماغ کو چیرتے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ قلمی تصاویر جو اس نے ایک مرقع میں جا بجا چپکا دی ہیں، احساسات کی ان عمیق گہرائیوں میں لے جاتی ہیں، جن سے رومانی افسانے اور عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ہمارے اذہان میں حقیقی زندگی کا انجکشن کر دیا ہے۔ یہ جُدا امر ہے کہ ہم اس کی بیان کردہ داستان کے محلِ وقوع کی سرزمین سے واقف نہیں۔ مگر اس نے ہمارے سامنے روسی زندگی ایسے صاف وعیاں طور پر پیش کی ہے کہ اب ہمیں مزید مطالعہ یا مشاہدہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

گورکی کا فقید المثال اور پُراسرار فن اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنے قلم کی سیدھی سادی جنبشوں سے ہم پر دہقان کی جھونپڑی کا منظر، سرما کی خون منجمد کر دینے والی سردی اور گاؤں کے نیم برہنہ لوگوں کی تھپیڑے کھاتی ایسی زندگی اور کھنڈروں میں انسانی ارواح کی کشمکش کی صحیح کیفیت طاری کر دیتا ہے —— اس کے علاوہ آرٹ کا مقصدِ کامیابی ہو بھی کیا سکتا ہے!

روس کے تمام ڈراموں میں جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں، یہ تمثیل سب سے نمایاں رتبہ رکھتی ہے۔ جس میں پرانے نظام کو پاش پاش کرنے کے لئے ایک طویل جنگ مدت تک کروٹیں لیتی رہی ہے۔

کم وبیش ایک سو سال تک روسی لوگ جیلوں کو آباد کرتے رہے مقننین اور جلادوں کو مشغول رکھا۔ سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں منجمد ہونا قبول کیا اور حکام کو خطرے کی گھنٹیاں بجا بجا کر جھنجھوڑتے رہے۔ جب ہمیں یہ حقیقت معلوم ہے کہ ستر سال کے دوران میں آٹھ لاکھ سے کچھ زیادہ سیاسی اسیر عدالت کے ایک

دروازہ سے سائبیریا میں دھکیل دیئے گئے تھے تو وہ واقعات جن کی گورکی نقاب کشائی کرتا ہے، بعید از فہم معلوم نہیں ہوتے۔

دراصل روس کی یہ جنگ آزادی اپنی مثال نہیں رکھتی۔ جمہوری حکومت کے لئے اٹلی کی پچاس سالہ کشمکش کو بھی اس پر وقعت نہیں دی جاسکتی۔

ہر سال ہزاروں روسی عورتیں اور مرد بڑھتے اور جلاوطن اور مرے ہوئے لوگوں کی خالی جگہ پُر کردیتے۔ یہ جاں نثار لوگ اس وقت تک دم نہ لیتے، جب تک حکومت کے بھیانک نظام کی سرد انگلیاں ان کا گلا نہ دبا دیتیں۔ میدان جنگ میں سر بکف نکلنا اس وقت واقعی معنی رکھتا ہے۔ جب دونوں فریق ہم پلہ ہوں۔ زندگی اور فتح کا ایک موقع ہو۔ اس صورت میں مادرِ وطن کے ہر فرزند کی رگ میں خون جوش سے ابلنے لگتا ہے۔ خطرے کا خوف غائب ہو جاتا ہے اور قربانیوں کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ مگر غیر مرئی خاموش عیار اور خونی قاتلوں سے تاریکی کے پردے میں جنگ کئے جانا ہمیشہ اپنی جان ہی کے خطرے کا احتمال ہونا، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کشمکش کا انجام یقینی موت ہے اور پھر اس انجام کو بے دھڑک قبول کر لینا، ایسی ہمت و جوانمردی ہے جو آج تک کوئی قوم نہیں دکھا سکی۔

روز بروز روس دیگر ممالک کی عنانِ توجہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور ابھی کافی مدت تک اپنی معاشری، سیاسی اور ادبی تحریکات کی وجہ سے کھینچتا رہے گا۔ موجودہ روس کو وہ شخص ہرگز اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا، جو پرانے روس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ روس کی جد و جہد آزادی کے زمانے پر روشنی ڈالنے کے لئے صرف گورکی کا چراغِ فکر ہی سب سے زیادہ تاباں ہے۔ وہ واقعات جنہیں قلم بند کرنے کے لئے

ایک فلسفہ دان اور مؤرخ سالہا سال کی طویل کوشش کے باوجود بھی ناکام رہتا۔ گورکی کی "ماتا" نے چند مختصر ابواب میں بیان کر دیا ہے۔ جب اس داستان کا مطالعہ کیا جائے تو روس روشنی میں نظر آتا ہے۔

زندگی جیسی ہے، نہ کہ جیسی ہو سکتی ہے، خیال کی جا سکتی ہے۔ یا ہو گی۔ یہ ہے گورکی کا فن اور یہی ہے روس کے دیگر افسانہ نگاروں کا راز!

نقلی مہیج نقلی انسانیت یا نقلی زندگی کے نقلی نقشوں سے روسی افسانہ نگاروں کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صرف کہانی کا ڈھانچہ خیالی ہو سکتا ہے اور بس! باقی افسانے کے سب کردار حقیقی ہونے لازمی ہیں۔

انسان کو بیک وقت حسین جوانمرد اور چالاک شیطان پیش کرنا ان کے نزدیک فن صحیح و صنعت سنجیدہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ مغربی افکار کے طومار کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ پریوں دیووں ناقابل فہم نوجوانوں اور لڑکیوں کی کہانیاں ان کی نظروں میں بالکل مہمل نظر آتی ہیں۔ وہ اسے بخوبی سمجھتے ہیں کہ ایسے واقعات پردۂ ظہور پر ہرگز نہیں آتے۔ مغربی کرداروں کی صفحات پر تھکا دینے والی بھاگ دوڑ کو وہ بچوں کا ایک کھیل خیال کرتے ہیں ـــــ وہ سخت حیران ہیں کہ مغربی اذہان کب اس خواب سے بیدار ہوں گے۔

گورکی کی قوتِ بیان کو سمجھنے کی خاطر اس فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے ـــــ اس کی تصانیف میں اس کے کردار بظاہر بالکل بے معنی سی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انسانی گفتگو ننانوے فی صدی اسی قسم کی ہوتی ہے۔ اس کے بیان کردہ لوگ عجیب عجیب حرکات کرتے ہیں۔ بہت جلد آگ ببھوکا ہو جاتے

ہیں، بغیر کسی وجہ کے فوراً ہی ان کا غصہ سرد ہو جاتا ہے۔ ان کی سرگرمیوں کا آغاز و انجام واقعات کی رفتار پر انحصار رکھتا ہے۔ علاوہ وہ اس دوران میں مقلد کے انتخاب کردہ ہتھیاروں کا کام دیتے ہیں۔ اس لئے کہ حیاتِ حقیقی میں ان کا یہی حصّہ ہے۔

یہ حقائق گورکی کے قلم سے اس انداز میں بیان کئے جاتے ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے وہ تاریک بھیانک بے رحم کورچشم اور خون میں لتھڑی ہوئی مشین واضح طور پر حرکت کرنے لگتی ہے جو روس پر حکومت کر رہی تھی۔ گورکی نے نہ صرف یہی کچھ کیا ہے بلکہ ہمارے جسم پر اس خوف کی کپکپی بھی طاری کر دی ہے۔ اس کی یہ تصنیف مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس آہنی دیو کی گرفت محسوس کرتے ہیں جو اس زمانے میں سرزمین روس پر ڈکار رہا تھا۔

اس طرح گورکی ہماری حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے اپنے خوفناک نظام کی حبس کی گرفت سے کوئی بھی رہائی نہیں پا سکتا، اس مرد کی جو اپنے مصائب کو فراموش کرنے کی دوا کو شراب خیال کر کے پیتا حیوان بن جاتا ہے، اور اس دیوانگی کی حالت میں اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا ہے اور اس نوجوان کی جو ایک کتاب میں دنیائے آزادی کی جھلکیاں دیکھ کر خود کو دہکتے ہوئے الاؤ میں گرا دیتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ دیو جس سے وہ برسرِ پیکار ہے کس آسانی سے اس کا غنچۂ حیات اپنے ہاتھوں سے مسل سکتا ہے، حکایت پیش کرتا ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے اس فرد کا افسانہ جو خطرناک مواقع کی نبض گرتی دیکھ کر انقلاب پسند جماعت کا رکن بن جاتا ہے، ناز و نعمت میں پلی ہوئی ان عورتوں کی داستان، جو بغیر کسی حیل و حجت کے کشمکشِ آزادی میں مردوں

کے دوش بدوش حصّہ لیتی ہیں، خواہ انہیں کیسے ہی لرزہ خیز مصائب سے کیوں نہ سامنا کرنا پڑے، تپ دق کے ایک خون تھوکنے والے مریض کے ایثار کا واقعہ جو اس جد وجہد میں تادمِ آخر حصّہ لیتا ہے، کمال فن کاری سے بیان کرتا ہے۔

ایک نوجوان اور دوشیزہ محبت میں گرفتار ہیں۔ وہ شادی کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر جنگِ آزادی میں شامل ہو جاتے ہیں —— اس لئے کہ محبت ان کے نیک مقصد میں حارج ہے۔ ایک تعلیم یافتہ مطالعہ کتب موسیقی اور امن کا دلدادہ ہے وہ ان کو فراموش کر دیتا ہے —— اس لئے کہ اس کی جد وجہد آزادی میں یہ چیزیں مخل ہیں۔ پھر اسی تعلیم یافتہ مرد کی نوجوان بہن اپنے خوش نما لباسوں اور پُر تکلف بچھونوں کو ٹھکرا کر انقلاب پسند جماعت میں ایک قلی کے فرائض انجام دیتی ہے۔

"ایک پُر از مسرت ہنسی کے ساتھ صوفیہ نے ماتا کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کا حال سنانا شروع کیا۔ جیسے وہ بچپن کی خوشگوار داستان ہو۔ صوفیہ کو اپنا نام تبدیل کرنا پڑا تھا۔ جاسوسوں کی تیز نگاہ سے بچنے کے لئے مختلف بھیس بدلنے پڑے تھے۔ ہزاروں من وزنی انقلابی کاغذات ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑے تھے اور اپنے رفیقوں کی رہائی کے لئے بیسیوں تدابیر عمل میں لانا پڑی تھیں۔ اس کے پاس کاغذات چھپانے کے لئے ایک چھوٹا سا پریس بھی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سپاہی تلاشی کے لئے باہر دروازے پر کھڑے ہیں تو اس نے ان کے اندر داخل ہونے سے ایک لمحہ پہلے خادمہ

کا لباس پہنا اور گھر سے باہر نکل گئی۔

وہ انہیں راستے میں ملی۔ چہرے پر صرف ایک ہلکی سی نقاب تھی۔ سر پر اس نے چھوٹا سا رومال اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں مٹی کے تیل کا بھبکا تھا۔ اس حالت میں وہ مکمل ایک دن سرما کی بے پناہ سردی میں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتی رہی تھی۔

اسی طرح ایک دفعہ اور یہ واقعہ ہوا تھا۔ وہ ابھی ایک غیر مانوس شہر میں چند رفیقوں کی ملاقات کے لئے پہنچ کر ان کے مکان کی سیڑھیاں ہی چڑھ رہی تھی کہ اسے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی تلاشی ہو رہی ہے۔ بھاگنا فضول تھا۔ اس لئے اس نے بغیر کسی تامل کے درمیانی چھت کے ایک دروازے کی گھنٹی دبا دی۔ اور دروازہ کھول کر ان نامعلوم اشخاص کے پاس چلی گئی جن سے وہ قطعاً ناواقف تھی اور اپنی موجودہ حالت صاف صاف بیان کر دی۔

"اگر آپ چاہیں تو مجھے سپاہیوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ مگر مجھے امید نہیں کہ آپ ایسا کریں گے۔"

ایسے مرد اور عورتوں کے حالات پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ مگر ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا سمجھنا سننا، ان کے کام کا مشاہدہ کرنا اور ننگے ہاتھوں سے مطلق العنانی کی ان سیسہ پلائی ہوئی خونی دیواروں کو منہدم کرنے کی سعی کرتے دیکھنا جو روس کے کمزور و نحیف سینے پر سوار تھیں۔ زیادہ اہمیت رکھتا ہے ——— یہ سب

مناظر گورکی اپنے قلم کی ایک جنبش ہی سے ہم پر واضح کر دیتا ہے۔ اور اس کی اس تصنیف کے اوراق پر پھیلا ہوا سحر اُبھر اُبھر کر ہمیں بالشوزم کے اسرار بتاتا ہے۔

ان مناظر میں ہم ایک بوڑھی عورت دیکھتے ہیں، جو اس افسانے کی روحِ رواں ہے۔ یہ عورت (ماتا) عمر رسیدہ ہے۔ ایک خاص شب تک وہ اسی مہلک نظام کے لاکھوں گونگے شکاروں میں سے تھی۔ بکمال صبر سے اپنے خاوند کی مار پیٹ سہتی تھی۔ اس کی کتابِ حیات میں ہر نیا باب اس امید کا حامل تھا کہ شاید وہ اپنے خاوند کی زد و کوب سے بچ جائے۔ اپنی ہڈیوں میں حیوانی زندگی کو برقرار رکھنا ہی اس کی واحد خواہش تھی۔

پھر ہم کیا دیکھتے ہیں؛

گورکی کا سحر آفریں قلم اسی ایک عورت میں تمام روس کو پیش کر دیتا ہے۔ بغاوت کا احساس اولیں اسے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ وہ خیال کرتی ہے۔ کیا؛ زار کے خلاف نبرد آزمائی ——— اسرائیلی قوم کے مقدس فرد سے جنگ آسمانی حکم سے بیگانگی جس نے یہ تاج پوش شیطان ان کی گردنوں پر مسلط کر دیا ہے؛

مگر یہ خیال تبدیل ہو جاتا ہے!

وہ دلکش، جان پرور اور عجیب خوابوں کے قریب پہنچ کر انہیں پسند کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ان میں حصہ لینا چاہتی ہے۔

نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یہ عورت ایسے صبر آزما پیمانہ شجاعت کا کام کرتی ہے، جن کے لئے دلیری

درکار ہے۔ بھیس بدلتی ہے کہ وہ سپاہیوں کے ساتھ ہم کلام ہو سکے۔ پُر مغز جاسوسوں کے ہجوم کو دھوکا دیتی ہے۔ کیچڑ اور برف سے اٹے ہوئے بازاروں میں میلوں سفر کرتی ہے کہ انقلابی لٹریچر تقسیم کر سکے۔ اپنے اکلوتے بچے کو جو دنیا میں اس کا واحد سہارا تھا، اس تحریک کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے اور آخر ش تھک کر چُور چُور گاڑی کے ظالم پہیوں سے لپٹ کر اپنی جان قربان کر دیتی ہے ——
مگر حالت نزع میں بھی اس کے لبوں پر آزادی کا وہی گیت ہوتا ہے۔

یہ موت اس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے جب وہ ایک مقامی سٹیشن پر اپنے لڑکے کی تقریر کی چھپی ہوئی کاپیاں بغل میں دبائے جا رہی تھی ——

پولیس کے سپاہی اور جاسوس اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور اسے "چور" "چور" کہہ کر پکار رہے ہیں۔ اس وقت تک وہ سخت خوفزدہ اور سرتاپا ارتعاش تھی اور اپنے آپ سے کہہ رہی تھی ——

"اگر وہ مجھے نہ ماریں تو کتنا اچھا ہو —— اگر وہ مجھے مارپیٹ نہ کریں تو کتنا اچھا ہو۔"

مگر "چور" کا لفظ اس کی خفتہ روح کو بیدار کر دیتا ہے —— اس کا خوف دور ہو جاتا ہے۔

"میں چور نہیں ہوں —— تم جھوٹ کہتے ہو۔"

وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بلند آواز میں چلائی۔ یہ کہتے وقت اس کی نظروں کے سامنے تمام چیزیں انقلابی چکر کی طرح رقص کرنے لگیں۔ اور ہتک کی تلخی نے اس کے دل و دماغ کو گرما دیا۔

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بستہ کھولا۔

"دیکھو! دیکھو! تم سب لوگ ادھر دیکھو!"

وہ چلائی اور اپنے لڑکے کی تقریر کی چھپی ہوئی کاپیوں کے مٹھے ہوا میں لہرائے۔ اپنے کانوں سے اس نے شور میں ان لوگوں کی حیرت کی صدائیں سنیں جو چہار اکناف سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔"

ماں اپنے بستے سے تقریر کی کاپیاں نکال کر ہوا میں اچھال دیتی ہے اور بلند آواز میں کہتی ہے:۔

"غربت۔ گرسنگی اور بیماری ——— یہ ہے جو کام، غریب لوگوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ حالات ہمیں جرائم اور بدکاریوں کی طرف کشاں کشاں لے جاتے ہیں۔ ہم سب کے اوپر امرا عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، اس غرض سے کہ ہم ان کے احکام بجا لائیں۔ پولیس حکومت سپاہی سب ان کے ہاتھ میں ہیں ——— یہ سب لوگ ہمارے درپے آزار ہیں۔ سب چیزیں ہمارے خلاف ہیں۔ ہم روز بروز محنت و مشقت اور غلیظ زندگی میں اپنی جانیں تباہ کر رہے ہیں ——— دوسرے ہمارے بہائے ہوئے پسینے پر عیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کتوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ رکھا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ خوف کے سائے تلے ہم ہر چیز سے خائف ہیں ——— ہماری زندگی رات ہے۔ ایک اندھیری رات! ——— ایک وحشت ناک خواب۔ انہوں نے ہمیں تیز زہر پلا رکھا ہے۔ وہ ہمارا

لہو پیتے ہیں۔ افراطِ عیش انہیں فربہ کر رہا ہے ——— شیطان
حرص کے غلام! ——— کیا وہ نہیں ہیں؟
"یہ دُرست ہے" لوگوں کی طرف سے جواب آیا۔
اس ہجوم کے پیچھے ماتا ایک مخبر اور دو سپاہیوں کو دیکھ کر جلدی جلدی کاغذوں کے گٹھے تقسیم کرنا شروع کر دیتی ہے۔ سپاہی پہنچ جاتے ہیں۔
"بنچ پر کھڑی ہو جاؤ" سپاہی ماتا کو حکم دیتے ہیں۔
"میں بہت جلد گرفتار کر لی جاؤں گی"
"یہ ضروری نہیں ہے"
"جلدی بولو! ——— وہ آ رہے ہیں"
پولیس کے سپاہی دوڑ کر موقع پر پہنچ جاتے ہیں اور ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماتا اپنی تقریر جاری رکھتی ہے۔
"لوگو، اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر لو!"
ایک موٹا سپاہی اپنے سرخ ہاتھ سے اس کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے۔
"خاموش رہو"
اس کی گردن دیوار سے ٹکرائی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے دل پر خطرے کا تاریک دھواں چھا گیا۔ مگر فوراً ہی وہ پھر شعلہ فشاں ہوئی۔
اسی لمحے ایک سپاہی دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور اُسے اپنا گھونسا تان کر دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔

"خاموش بوڑھی مکّار!"

یہ سن کر ماتا کی آنکھیں کھلیں چمکیں۔ اس کے جبڑے کانپے، پھسلتے ہوئے پتھروں پر قدم جما کر اور اپنی قوّت کے آخری ٹکڑے فراہم کرنے کے بعد وہ چلائی:۔

"بیدار روح کو وہ ہرگز فنا نہیں کر سکتے"

سپاہی نے اپنا ہاتھ جھٹک کر اس کے منہ پر ضرب لگائی، ایک لمحہ کے لئے کسی سرخ و سیاہ چیز نے اس کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ خون کا نمکین ذائقہ اس کے منہ کو بدمزہ کر رہا تھا۔

وہ اسے زدوکوب کرتے گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ اس حالت میں بھی وہ برابر کہے جاتی ہے:۔

"تم حق کو خون کے سمندر میں غرق نہیں کر سکتے"

پھر وہ اس کا اور اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

یہ ہے اس عورت کی داستان جو اپنے خاوند کی مار پیٹ سے خمیدہ کمر سیدھی کرنے کے بعد آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئی۔ اور ظالم سپاہیوں کے ہاتھوں دوسرے لوگوں کو خواب غلامی سے بیدار کرنے کی سعی کرتی جان دے گئی۔

اس کا لڑکا پیول شروع شروع میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا جاتا ہے۔ اپنے باپ کی وفات کے دو ہفتے بعد وہ شراب سے مخمور گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اور اپنے باپ کی طرح ایک کونے میں لڑکھڑاتا ہوا بیٹھ کر چلاتا ہے۔

"کھانا!"

اُس کی ماں آئی۔ اور اس کے سر کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ مگر پیول نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"جلدی کرو"

"ماتلے نے غمگین اور محبت بھری آواز میں کہا" بیوقوف لڑکے!

مگر پیول شراب سے مخمور ہے وہ اسی کو رازِ حیات سمجھتا ہے کہ اپنے باپ کی پیروی کرے۔ وہ شراب کے نشے میں کہتا ہے۔

"لاؤ! میرے باپ کا پائپ کہاں ہے؟ میں آج سے تمباکو پینا بھی شروع کروں گا!"

پہلی مرتبہ اس نے شراب کو منہ لگایا ہے۔ گو شراب نے اس کے جسم کو کمزور اور مردہ کر دیا ہے مگر اس کا ضمیر زندہ ہے، جو اسے ملامت کرتا ہے اور اس کے کانوں میں پکارتا ہے کہ وہ شرابی ہے —— ایک بیہوش شرابی!

ماں کی محبت اسے سخت تکلیف پہنچاتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں غم کی جھلک دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی صرف ایک خواہش ہے کہ وہ روئے اور خوب روئے۔ اس خواہش پر غلبہ پانے کے لئے وہ اپنے آپ کو زیادہ مخمور کرتا ہے۔ مگر ماں اسے پیار سے کہتی ہے۔

"بیٹا! تم نے ایسا بُرا کام کیوں کیا —— تمہیں یہ چاہیئے نہیں تھا!"

تھوڑی دیر کے بعد ماں اسے بستر پر لٹا دیتی ہے اور اس کی دہکتی پیشانی پر ٹھنڈے پانی سے تر تولیا رکھ دیتی ہے۔ اس پر پیول کو قدرے ہوش آتا ہے۔ اور وہ سوچتا ہے :۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے قبل از وقت شراب نوشی شروع کر دی ہے۔
دوسرے بھی تو پیتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوتا، پر میں بیمار پڑ گیا ہوں۔"
کمرے کے کسی حصّے سے ماتا کی غمگین آواز سنائی دی:۔
تم نے ابھی سے شراب پینا شروع کر دی ہے۔ اب تم میری خبر گیری
کیسے کر سکو گے۔"
پیول آنکھیں بند کر کے جواب دیتا ہے:۔
"ہر شخص پیتا ہے۔"

"ہر شخص پیتا ہے۔" ان مختصر الفاظ میں گورکی نے ان تمام مزدوروں کا صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے جو مشقت سے چور چور ہو کر کسی ارضی لذت کے خواہاں تھے، وہ شراب کیوں پیتے تھے؟ اس کے جواب کے لئے گورکی کے اپنے الفاظ موجود ہیں۔

"سالہا سال کی جمع شدہ تھکاوٹ نے ان کی بھوک چھین لی تھی۔ کچھ کھا سکنے کے لئے وہ شراب نوشی کرتے ——— اپنے کمزور معدوں سے کام لینے کی خاطر "ووڈکا" کی جھلس دینے والا چابک استعمال کرتے تھے۔"

اپنے بیٹے کا جواب سن کر ماتا ٹھنڈی سانس بھرتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا لڑکا درست کہتا ہے۔ ماتا کو اچھی طرح علم ہے کہ شراب خانے کے سوا مزدوروں کے لئے کوئی اور جگہ نہیں، جہاں وہ اپنا غم غلط کر سکیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے بچے کو نصیحت کرتی ہے کہ اسے شراب نوشی ترک کر دینی چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کے باپ نے اس کے حصّے کی پی کر اسے کافی سے زیادہ تنگ کیا تھا۔

پیول کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

"ماں کی غمگین اور ترحم انگیز گفتگو سن کر پیول نے خیال کیا کہ اس کی ماں اپنے خاوند کی بے جا مار پیٹ سے بچنے کے لئے ہمیشہ چپ چاپ رہا کرتی تھی وہ خود چونکہ اپنے والد کی خشمگین نگاہوں سے بچنے کی خاطر ہمیشہ گھر سے غیر حاضر رہا کرتا تھا اس لئے اسے اپنی ماں کو جاننے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا۔ مگر اب جوں جوں اسے ہوش آنے لگا، اس نے اپنی ماں کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا۔

اس کی ماں لانبے قد کی اور اوپر سے ذرا جھکی ہوئی تھی۔ اس کا بھاری جسم سالہا سال کی ان تھک محنت اور خاوند کی مار پیٹ سے اب بڑی مشکل سے ہلتا تھا۔ وہ کمرے میں اس انداز سے ٹہل رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا ابھی گر پڑے گی۔

یہ دیکھ کر اور اس پر غور کرنے کے بعد پیول اسی دم شراب کی لعنت دور کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے اور پھر کبھی مے نوشی نہیں کرتا۔

وہ مے نوشی نہیں کرتا تو کیا کرتا ہے؟

ایک کتاب اس کے خفتہ سازِ دل پر مضراب کا کام دیتی ہے اور اس کے پیدا کردہ نغمات سے متاثر ہو کر وہ انقلاب پسند جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ ——— شرابی قصرِ آزادی کا معمار بن جاتا ہے۔ روس کے گلی کوچے اس کی صدائے انتقام سے گونج اٹھتے ہیں۔

پیول اپنے رفیقوں سمیت پکڑا جاتا ہے اور عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا

ہے۔ وہاں وہ اپنا بیان دیتا ہے۔

"ہم اشتراکی ہیں ——— سرمائے کے دشمن، جو لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔ جو انسان کو انسان کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتا ہے ——— ہمارے نزدیک وہ سماج جو انسان کو اپنی دولت بڑھانے کا آلہ تصور کرتا ہے، غیر انسانی ہے۔

ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ اور ہر اس بندش کے خلاف جو انسان کو جکڑے ہوئے ہے لڑیں گے۔ خواہ وہ اخلاقی ہو یا جسمانی ——— ہم مزدور ہیں ——— وہ لوگ جن کی مشقت ننھے کھلونوں سے لے کر دیو قامت مشینیں تک تیار کرتی ہے۔ ہم وہ افراد ہیں جو اپنی عزت نفس کو برقرار رکھنے کے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ہر شخص ہمیں استعمال کرنے میں کوشاں ہے اور اپنے آرام کے لئے ہمارا ہر وقت استعمال کیا جاتا ہے ——— اب ہم اتنی آزادی کے خواہاں ہیں جو ہمارے لئے تمام قوتوں کو مسخر کرنا ممکن بنا دے۔ ہمارا مطمح حیات بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ تمام اختیار عوام کے ہاتھوں میں پیداوار کے تمام ذرائع عوام کے لئے۔ سب کے لئے کام کرنا فرض ——— انفرادی سرمائے کی بیخ کنی اور بس۔ آپ دیکھتے ہیں۔ ہم باغی نہیں ہیں"

جج آغوش جہالت میں پرورش پائے ہوئے شخص کے منہ سے فاضل مقرر ایسے الفاظ سن کر بہت حیران ہوتا ہے۔ مگر فوراً ہی اسے اصل موضوع کی طرف پلٹنے کا

حکم دیتا ہے۔ پیول تھوڑی دیر کے بعد اپنی تقریر شروع کرتا ہے۔

"ہم انقلابی ہیں۔ اور اس وقت تک انقلابی رہیں گے۔ جب تک ذاتی سرمائے کا وجود باقی ہے۔ جب تک چند افراد حکومت کرتے ہیں اور باقی صرف محنت و مشقت کرتے ہیں —— ہم فتح یاب ہوں گے —— ہم مزدور یقیناً جیتیں گے۔ تمہاری سوسائٹی اتنی طاقتور نہیں ہے، جتنی کہ تم سمجھ رہے ہو! یہی سرمایہ جس کی حفاظت اور پیدائش کے لئے سوسائٹی لاکھوں انسان قربان کرتی ہے —— یہی قوت، جو اسے ہم پر حکومت کرنے کا اختیار بخشتی ہے۔ اس کے افراد کی جسمانی و اخلاقی تباہی کا باعث ہے۔ سرمایہ کے لئے انتہائی حفاظت درکار ہے۔ اور درحقیقت تم سب ہمارے حکام ہم سے زیادہ غلام ہو —— تم روحانی لحاظ سے غلامی کی زندگی بسر کرتے ہو اور ہم جسمانی لحاظ سے —— تمہاری قوت —— تمہارا سرمایہ تمہیں کئی حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جو ایک دوسرے کو نگلنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہماری قوت ایک زندہ طاقت ہے۔ جس کی بنیاد مزدوروں کی ہمیشہ بڑھنے والی بیداری ہے۔ تمہارا ہر کام جرم سے وابستہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد عوام کی غلامی کے جال میں پھنسانا ہے۔ ہمارا کام دنیا کو ان تمام مہیب دیوؤں سے نجات دلانا ہے جو تمہاری حرص کے پیدا کردہ ہیں۔ تم نے لوگوں سے زندگی چھین کر انہیں کچل دیا ہے۔ اشتراکیت تمام دنیا کو آپس میں جوڑ دے گی۔

جو تمہارے بوجھ تلے دب کر شکستہ ہو چلی ہے ـــــــ اور یہ ضرور ہو گا!"

پیوٹل یہاں تک پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھہرتا ہے۔ اور پھر آہستہ لہجہ میں کہتا ہے۔

"اور یہ ضرور ہو گا!"

پیوٹل کے رفقاء میں اینڈری کا کردار بہت دلچسپ ہے، بات بات پر مزاحیہ نوک جھونک کرنے میں اُس کو مزا آتا ہے۔ عدالت میں پیش ہے، سائبیریا کے یخ بستہ میدان آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہیں، مگر وہ ججوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتا۔

"اینڈری اٹھا۔ اس نے اپنے جسم کو حرکت دی۔ ججوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اور کہنے لگا۔

"معزز مدعا علیہ حضرات ـــــــ"

"عدالت تمہارے سامنے ہے نہ کہ مدعا علیہ"

اینڈری کے چہرے اور گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدالت کو تنگ کرنے تُلا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے لانبے ہاتھوں سے اپنے سر کو تھپکا اور کہا۔

"سچ مچ، مگر میرا خیال کچھ اور ہے تم جج نہیں ہو محض مدعا علیہ ہو ـــــــ"

یہ سن کر ایک جج خشک لہجے میں پکارتا ہے۔

"ازراہِ عنایت وہی بیان دو جو اس مقدمہ سے متعلق ہے۔"

"جو مقدمے سے متعلق ہے؟ بہت خوب! چلئے میں نے یقین کر لیا کہ آپ واقعی جج ہیں ——— خود اختیار اور ایماندار"

"عدالت یہ کردار نگاری نہیں چاہتی۔"

"اس کردار نگاری کی ضرورت نہیں؛ اچھا میں اپنا بیان جاری رکھتا ہوں ——— تم وہ افراد ہو جو اپنے اور اجنبیوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے۔ تم آزاد ہو۔ اب یہاں دو فریق تمہارے روبرو کھڑے ہیں۔ ایک شکایت کرتا ہے "مجھے اس نے لوٹ کر برباد کر دیا ہے" اور دوسرا جواب دیتا ہے "مجھے لوٹنے کا حق ہے۔ اس لئے کہ میرے بازو موجود ہیں ———"

عدالت پھر اسے خاموش رہنے کا حکم دیتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اس قسم کی گفتگو سننا پسند نہیں کرتی۔ افسانے کا یہ مزاحیہ کردار چند اور الفاظ کہنے کے بعد اپنا بیان بند کر دیتا ہے۔

"جو آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ میرا رفیق بتا چکا ہے ——— باقی پھر کہا جائے گا ——— وقت پر دوسرے گوش گزار کر دیں گے ———"

ان سیاسی قیدیوں یعنی ہیرو کے رفقاء میں جو سائبیریا میں جلاوطن کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک نوجوان کا آتشیں کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے مختصر بیان کی نفسیات مطالعہ کرنے کے بعد ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک جوان قلب میں آزادی کی آگ کس تیزی سے بھڑکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس کے الفاظ میں

کم تجربہ کاری اور بچپن کی جھلک بھی دیکھتے ہیں۔

"ننھا یزن شامپین کی بوتل کے کاگ کی طرح اُٹھا اور لرزاں آواز میں کہنے لگا:۔

"میں ——— میں قسم کھاتا ہوں ——— مجھے معلوم ہے۔ تم نے مجھے ملزم قرار دیا ہے ———" یزن کا سانس اکھڑ گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اس کے تمام چہرے کو نگلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بلند آواز میں بولا:۔

——— میں ——— اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ تم مجھے خواہ کہیں بھیج دو ——— میں فرار ہو جاؤں گا ——— واپس آ جاؤں گا ——— ——— ہمیشہ یہی کام کروں گا ——— اپنی زندگی بھر! ——— مجھے اپنی عزت کی قسم ہے!"

ماں کے تمام کرداروں سے فرداً فرداً بحث ایک طویل مضمون کی محتاج ہے۔ اس مختصر مضمون میں حتی الوسع ماں پر ہر پہلو سے روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے مگر پھر بھی یہ مضمون تشنہ ہے۔

اب ہم گورکی کے فن منظر کشی کی طرف پلٹتے ہیں۔ یہاں ماں میں سے ہم مثال کے طور پر چند مناظر پیش کرتے ہیں جو قارئین کے لئے یقیناً دلچسپ ہوں گے۔

ماں کے منظر افتتاحیہ میں گورکی کارخانہ کی طرف رُخ کرنے والے مزدوروں کی تصویر ان زندہ الفاظ میں پیش کرتا ہے:۔

"ہر روز کارخانے کی سیٹی، مزدوروں کی غلیظ اور دھوئیں سے پُر

فضا میں کانپتی آواز میں غراتی، جس پر بھاپ کے غلام اپنے چھوٹے اور بدنما گھروں سے نکلنا شروع ہو جاتے۔ غمگین چہروں کے ساتھ وہ خوف زدہ وحشیوں کی طرح تیز قدم بڑھاتے۔ ان کے اعضا ناکافی نیند کی وجہ سے اکڑے ہوتے۔ صبح کی دھندلی روشنی میں وہ تنگ گلیوں اور کچی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اس سنگین پنجرے کی طرف بڑھتے جو ان کے استقبال کا منتظر ہوتا ——— جس کی بیسیوں زرد، بھدی اور چوکور آنکھیں کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک کو روشن کر رہی ہوتیں۔ کیچڑ کے چھینٹے ان کے پیروں پر اس طرح گرتے گویا ان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ فضا بھدی خواب زدہ آوازوں اور گالیوں سے معمور ہوتی۔ ان کے استقبال کے لئے مشینوں کی بھاری گڑگڑاہٹ اور بھاپ کی غیر مطمئن چیخ پکار ہوا میں تیر رہی ہوتی ——— دراز قامت دُود کش دُھوئیں کے گہرے اور موٹے بادل اپنے حلق سے نکالنا شروع کر دیتے۔"

یہ تو ہے مزدوروں کی کارخانوں کی طرف روانہ ہونے کی تصویر۔ اب ان کی واپسی کا نقشہ بھی گورکی کا معجز نگار قلم یوں کھینچتا ہے:۔

"شام کو سورج غروب ہوتے وقت سُرخ کرنیں گھروں کی کھڑکیوں پر چمک رہی ہوتیں۔ کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کے مانند باہر پھینک دیتا۔ اب وہ پھر ان ہی بازاروں سے اپنے دھوئیں میں لپٹے ہوئے چہرے اور گرسنہ دانتوں کی چمک کی نمائش کرتے مشین

کے تیل کی غلیظ بُو کو پھیلاتے گزرتے۔ مگر اب ان کی آوازوں میں خوشی کی جھلک پائی جاتی ——— مشقت کی سزا اس دن کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ آرام کی چند گھڑیاں اور روکھا سوکھا کھانا گھر پر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

دن کارخانہ نگل گیا اور مشین نے ان انسانوں کے اعضاء سے حسبِ ضرورت طاقت چوس لی۔ اس طرح ایک مکمل دن زندگی سے جذب کر لیا گیا جس کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

مزدور اس حیوانی مشقت کے باوجود کیونکر زندہ رہتا ہے۔ اس کے جواب کے لئے گورکی کے الفاظ موجود ہیں:۔

"انسان نے قبر کی طرف قدم بڑھائے، مگر جب اس کو نزدیک ہی آرام کی راحتیں اور مے خانوں کی مسرتیں نظر آئیں تو وہ مطمئن ہو گیا!"

یہ ہمیں بھی معلوم تھا۔ مگر گورکی نے اسی خیال کو اپنے سحر آفریں الفاظ میں پیش کر دیا۔ مرصّع الفاظ سے اپنے فن کی زیبائش کرنا ——— یہی گورکی کا راز اور یہی اس کی فقید المثال صنعت ہے۔ ان الفاظ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس سحر کار کی ناقابلِ نقل فن کاری عیاں ہو جاتی ہے اور پھر کسی مزید تفصیل کی حاجت نہیں رہتی۔

تعطیل کے دنوں میں گورکی نے برگشتہ بخت اور واژگوں نصیب مزدوروں کی نفسیات اس پیرائے میں بیان کی ہے کہ ایک کم عقل بچہ بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ دراصل گورکی وہی بیان کرتا ہے جو اس سے پیشتر ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے۔ مگر اس

کے الفاظ پہلو میں اس سوئے ہوئے احساس کو اپنے ترنم سے بیدار کر دیتے ہیں۔

"تعطیل کے روز مزدور دن کے دس بجے تک سوئے رہتے۔ بوڑھے اور شادی شدہ لوگ بہترین کپڑے پہن کر نوجوانوں کو گرجا میں عبادت کے لئے نہ جانے کی بنا پر برا بھلا کہتے۔ پادری کا خطبہ سننے کے لئے جاتے گرجے سے واپس آکر وہ کچھ کھا کر پھر سو جاتے ——— شام کے وقت وہ سڑکوں پر آوارہ چکر لگاتے۔ جن کے پاس بڑے بوٹ ہوتے، وہ انہیں پہن لیتے خواہ بازار صاف ہی ہوں۔ جن کے پاس چھاتے موجود ہوتے وہ انہیں اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے، خواہ آسمان بالکل ابر آلود نہ ہو۔"

یہ پڑھنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسی نکمی چیزوں کی کیوں نمائش کرتے ہیں؟ ——— گورکی فوراً ہی جواب دیتا ہے:۔

"ہر شخص یہی خواہش کرتا ہے کہ وہ کسی طریقے سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو، اپنے ہمسائے سے زیادہ معزز دکھائی دے۔" پھر وہ ان مزدوروں کی آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ بیان کرتا ہے۔ کتنے سادہ الفاظ ہیں، جو دل و دماغ میں سے گزرتے روح میں جذب ہو جاتے ہیں:۔

"روزانہ مشقت سے تھکے ہوئے لوگ شراب کا کثرت سے استعمال کرتے، جس سے ان کے دلوں میں ایک ناقابل بیان بے چینی پیدا ہو جاتی جو باہر نکلنے کے لئے راستہ مانگتی۔ اس خاموش نہ ہونے والے اضطراب کا بوجھ

ہلکا کرنے کے لئے وہ معمولی سے معمولی واقعات کو اہمیت دیتے اور اور وحشیوں کی طرح حقیر سے حقیر چیز پر ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگ جاتے۔ یہ کینہ ان کے دلوں میں ناقابلِ علاج لکان کی طرح جو ان کے اعضاء میں گھر کر چکا تھا بڑھتا رہتا ۔۔۔ وہ اس روحانی بیماری کو ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے جو انہیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی تھی ۔

گورکی اسی جماعت کا ایک برہنہ پا و گرسنہ شکم فرد تھا اور وہ اب اسی ملت کا سب سے بڑا مفکر سحر کار مصور پیغام بر قصہ خواں افسانہ نویس اور تمثیل نگار ہے۔

سُرخ انقلاب

وُسعتِ ارضی کے لحاظ سے یورپ میں رُوس سے بڑی کوئی حکومت نہ تھی۔ اور بہ لحاظ مطلق العنانی زار یورپ کے بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ روسیوں نے اُسے شانِ اُلوہیت دے رکھی تھی۔ وہ اس کی غلامی کو اپنی سعادت اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنا فرض جانتے تھے۔ زار کی زبان کا ہر لفظ الٰہی تھا۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فرمانِ ربانی۔ وہ جسے چاہتا سزا دیتا۔ اور جس کو چاہتا، تختۂ دار پر لٹکا دیتا۔ اُس کی نظروں میں جرم اور بے جرمی کا مفہوم کچھ نہ تھا۔ ہر سزا کے لئے صرف ارادۂ سلطانی کافی تھا جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا تھا۔ رعایا اسی میں خوش تھی کہ غیروں کی ٹھوکریں کھانے سے یہ تذلیل بہتر ہے۔ وہ اپنے بادشاہ کے ہر ظلم کو برداشت کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ ان کا آقا تھا اس کی ہر خواہش ان کی خواہش تھی ——— اس لئے کہ وہ ان کا باپ تھا اور اس کی ہر بولی فرمانِ الٰہی تھی ——— اس لئے کہ وہ ظلِ الٰہی تھا۔

مگر دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر رینگنے والے روسی اٹھے اور عقابوں کی طرح

فضا کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگے۔ اب جس چیز کو وہ شہد سمجھ کر چاٹ رہے تھے، حنظل سمجھ کر نفرت کے منہ پر تھوکنے لگے۔ اطاعت کیش سر متمردانہ کھنچنے لگے —

ہر شخص آزادی کی قدر و قیمت سے واقف ہو گیا۔ کورنش بجا لانے والے ہاتھ اٹھے اور زار یت کی گردن کو ہمیشہ کے لئے دبا دیا۔ یہ سب کچھ کس طرح ہوا؟

اس مختصر مقالے میں روس کے اس عظیم الشان انقلاب کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

"الگزنڈر اول جب اپنی کثیر التعداد فوجیں لے کر نپولین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے فرانس کی طرف بڑھ رہا تھا تو اسے مطلق خبر نہ تھی کہ اس کے سپاہی اپنے ساتھ ایسے جراثیم لائیں گے جو تخت و تاج کے لئے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نپولین کی فوجیں جس جگہ پہنچیں انہوں نے نوک سنگین سے انقلاب کے بیج بوئے۔" نپولین کی قائم کی ہوئی سلطنت واٹرلو کے میدان میں فنا ہو گئی۔ اور وہ خود نظر بند ہو کر سینٹ ہلینا کی صحت ربا غربت میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد جب روس کے سپاہی جو عموماً کسان تھے، اپنے گھروں کو واپس لوٹے تو ان کے سینے مشعل آزادی سے منور تھے۔

۱۸۱۶ء میں روس کے سپاہیوں نے ایک خفیہ انجمن بنائی۔ اس کا نام "انجمن نجات" تھا۔ اس میں تین خیالوں کے آدمی شامل تھے۔ ایک طبقہ مرادئیف کے رفقا کا تھا۔ جو انگریزوں کے دستور کو پسند کرتا تھا۔ دوسرا گروہ نکولائی تورگنیف کے رفیقوں کا تھا، جو صرف کاشتکاروں اور مزارعوں کی آزادی کا طالب تھا۔ تیسرے طبقے کا راہنما پال پستل تھا۔ یہ لوگ کامل جمہوریت کے طلبگار تھے اور تخت و تاج

کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ چونکہ اس انجمن میں اصولی اختلاف تھا۔ اس لئے یہ کوئی مفید کام کئے بغیر ٹوٹ گئی۔ اور اس کی جگہ ایک اور انجمن نے لے لی۔ جس کا نام "انجمن فلاح" تھا۔ اس کے سرگرم اراکین میں سے ایک پستل تھا۔ اور دوسرا مشہور روسی شاعر رائی لیف۔ پستل فوج کا عہدہ دار تھا۔ اسے تبدیل کر کے جنوبی روس میں بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے اپنی سوسائٹی کو بہت مضبوط کر لیا۔ اب "انجمن فلاح" کی دو شاخیں ہو گئیں۔ شمالی شاخ رائی لیف کے ماتحت تھی اور دستوری حکومت چاہتی تھی۔ جنوبی شاخ پستل کے ماتحت تھی اور جمہوریت کی خواہاں تھی۔

۱۸۲۵ء میں الگزنڈر اوّل کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تخت کا وارث اس کا بھائی کانستنتائن تھا۔ لیکن چونکہ الگزنڈر اوّل اپنے اس بھائی سے ناراض تھا اس لئے اس نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو ولی عہد بنا دیا تھا۔ لیکن اس وصیت سے سب بے خبر تھے۔ اس لئے کانستنتائن نے اپنے عہد کے مطابق نکولس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ادھر نکولس نے کانستنتائن کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ گو اس وقت بظاہر دو بادشاہ تھے۔ لیکن حقیقتاً ایک بھی بادشاہ نہ تھا۔ "انجمن فلاح" کے کارکنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ چونکہ یہ بغاوت دسمبر ۱۸۲۵ء میں ہوئی تھی اس لئے یہ "دسمبریوں کی بغاوت" کے نام سے مشہور ہے اور اس بغاوت میں شریک ہونے والوں کو "دسمبریوں" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پستل دورانِ بغاوت ہی جنوبی روس میں گرفتار کر لیا گیا۔ رائی لیف نے

لینن گراڈ میں ہنگامہ برپا کر کے شاہی محل کی بنیادیں ہلانا چاہیں مگر نکولس کی آتشبازی کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پستل میدان جنگ میں بارود اور گولیوں سے کھیلنے والے جنرل نے دوران مقدمہ میں اپنے ایک ساتھی کا نام بتا دیا۔ اس پر تمام باغی پکڑے گئے۔ مگر غیر مرئی اشیاء کا مطالعہ کرنے والے شاعر رائی لیف کو عدل وانصاف کے بھیانک پتلے مرعوب نہ کر سکے۔ وہ آخر وقت تک کہتا رہا کہ سارا جرم اس کا ہے اور باقی سب بے گناہ ہیں۔

نکولس نے اس بغاوت کے پانچ سرکردہ رہنماؤں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اور باقی "دسمبریوں" کو سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں جلا وطن کر دیا۔ آتشِ انقلاب کو سرد کرنے کے لئے رائی لیف اور پستل تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے۔

اب نکولس نے جبر و تشدد اور فنا کو بادۂ ہر جام کر دیا۔ تمام اصلاحات روک لیں۔ طلبہ اور اخبار نویسوں پر علی الخصوص سخت پابندیاں عائد کیں۔ درسگاہوں میں فلسفے اور اقتصاد کی تعلیم ممنوع قرار دی۔ نکولس نے تیس سال تک ایک جابر اور قاہر بادشاہ کی طرح حکومت کی۔ جاسوس اور سنسر اور اس کے تاج وتخت تھے۔ اس کی حکومت کا مدار استبداد کے سوفاروں پر تھا۔ ہر روسی کی زندگی اور موت کے درمیان جاسوس حائل تھے۔ خاموشی اور اظہار کے درمیان سنسر کا پردہ لٹک رہا تھا۔ کلکِ ادیب ضبط کر لی گئی تھی ——— ایک لاکھ پچاس ہزار روسی جلا وطن کر دیئے گئے تھے اور لاکھوں انسان روسی زبانوں کی رونق بڑھا رہے تھے۔ غرضیکہ نکولس کے عہدِ حکومت میں روس کی حالت بے حد نازک ہو گئی تھی۔ اس کی خارجی حکمتِ عملی نے اسے تمام یورپ میں بدنام کر دیا۔ اس نے پولستان کو روس سے

ملحق کر دیا۔ روس کی آمدنی سے چالیس فی صدی فوج پر خرچ کیا جاتا۔ نکولس اپنی فوج پر بہت نازاں تھا۔ لیکن کریمیا کی جنگ میں اسے ان کی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ سپاہی جو نپولین کی فوجوں کو تنگ کرتے رہے۔ ترکی اور برطانی سنگینوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس دوران میں عوام کی آنکھوں سے زاریت کے رعب کا پردہ اٹھ گیا۔ روس نے جنگ کریمیا کے بعد وہی کیا جو جرمن نے جینا کے بعد کیا تھا۔

۱۸۵۵ء میں نکولس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا الگزنڈر دوم تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے باپ کی عائد کردہ تمام پابندیاں دور کرنا شروع کر دیں اخباروں سے سنسر اٹھا لیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس نے کاشتکاروں کو کچھ مراعات بھی دیں۔ اب نظام حکومت کی کچھ خوبیاں بروئے کار آنے لگیں اسی دوران میں "عدمیوں" کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو بادشاہوں کو موت کے گھاٹ اتارنا سب سے بڑی خدمت سمجھتا تھا۔

"عدمیوں" کی اصلاح روس میں سب سے پہلے تورگنیف کے ناول "اخلاف و اسلاف" میں نظر آتی ہے۔ یہ ناول ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ تورگنیف دیکھتا ہے کہ دانش گاہوں کے طالب علم اپنے نظریات میں عوام سے بالکل جدا ہیں۔ وہ ان میں نئی روح کارفرما دیکھتا ہے۔ فی الحقیقت یہ عدمی اپنی قسم کے واحد لوگ تھے۔ عدمی لڑکے اپنے بالوں کو کندھوں پر اٹھائے ماسکو کے گلی کوچوں میں چکر کاٹتے۔ وہ عوام سے بلا تکلف گفتگو کرتے اور تجدید پسندی کا درس دیتے۔ عدمی لڑکیاں ترشوائے ہوئے بالوں سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتیں۔ نیلگوں چشموں نے

ان کے دانشمندانہ چہروں کی زینت کو دوبالا کیا ہوتا ــــ جہالت کدۂ روس میں حُسن انقلاب کی دعوت دے رہا تھا:

الگزنڈر بہت کمزور دل تھا۔ ملک کی بُری حالت دیکھ کر اکثر اُس کے دل میں اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا مگر اس کے دربار کے منحوس کوؤں کی کائیں کائیں اسے کچھ کرنے نہ دیتی۔ جب اس کے مشیر اس سے یہ کہتے کہ اصلاحات سے سلطنت ضائع ہو جائے گی تو ہمدردی کا جذبہ اس کے دل میں سرد پڑ جاتا۔ تاہم اس نے اصلاحات کے دامن سے اشک شوئی کی کوشش کی مگر عدمی ان طفل تسلیوں کو خاطر میں نہ لانے والے تھے۔ وہ فوری تغیر کے آرزومند تھے۔ وہ اشتراکی نظام حکومت کے خواہاں تھے۔ چونکہ مرکزی حکومت میں ان کو اقتدار حاصل تھا اس لئے وہ اپنے عقائد کی نشرو اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ اعلیٰ درسگاہوں سے مبلغ تبلیغ کے لئے نکل آئے۔ ہر مبلغ آزاد تھا کہ وہ جس طرح چاہے اپنے عقائد لوگوں تک پہنچائے۔

اسی دوران میں الگزنڈر پر دو مرتبہ ناکام حملے ہوئے۔ انجام کار ۱۸۸۱ء میں ایک نوجوان لڑکی نے اسے مہلک طور پر زخمی کر دیا اور ایک گھنٹے کے بعد روس کی فضا میں اس بادشاہ نے سانس لینا بند کر دیا۔

الگزنڈر دوئم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے الگزنڈر ثالث نے حکومت کی۔ اس کے عہد میں جبر و تشدد کا بازار خوب گرم ہوا۔ اس قدر کہ زندانوں میں صدہا نوجوان ٹھونس دیے گئے۔ آزادی کے پرستاروں کے لئے یہ سخت مصائب کا دور تھا۔ قہر و غضب کی تلوار ہر روسی کی گردن پر لٹکتی رہتی تھی ــــ لیکن آزادی

کا یہ سیلاب ایسے بند باندھنے پہ نہ رک سکا۔ بادشاہت رعایا کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی۔ استبداد کی آندھیاں ٹمٹماتے چراغوں کو گُل کرسکتی ہیں مگر انقلاب کے شعلوں پران کا کوئی بس نہیں چلتا۔ نوجوان روسی اپنے سینوں میں انتقام کی آگ سلگاتے ہوئے بڑھے اور بڑھتے رہے۔

۱۸۹۴ء میں الگزنڈر ثالث کا انتقال ہوگیا اور نکولس ثانی زار بنا، جو خاندان رومانوف کا بہادر شاہ تھا۔ یہ زار روس کا آخری بادشاہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اس میں روس کی شکست نے باشندگانِ روس کو نظامِ حکومت کا اور بھی زیادہ دشمن کردیا۔ ۱۹۰۵ء میں مزدوروں نے اپنی شکایت کو زار کے کانوں تک پہنچانے کی غرض سے ایک مظاہرہ کیا۔ مزدوروں کے اس گروہ پر حکومت کی طرف سے گولیاں برسائی گئیں۔ صدہا مزدور مشعلِ آزادی پر پروانہ وار فدا ہوگئے۔

روسی محبانِ وطن میں ٹراٹسکی اور لینن بھی شامل تھے۔ ولادی میر ایلیچ لینن ۱۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو ایک زمیندار کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ بچپن ہی میں اس کے خیالات بہت انقلابی تھے ابھی اسے یونیورسٹی میں داخل ہوئے صرف ایک ماہ ہی گزرا ہوگا کہ طلبہ کی تحریک انقلاب میں حصہ لینے کی بنا پر اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ لیکن اس کے باوصف اس نے وکالت کی سند حاصل کرلی۔ لینن نے وکالت کو اپنا پیشہ قرار نہ دیا کیونکہ مارکس کی طرح اس کا مطمحِ نظر بھی بہت بلند تھا۔ دو سال کی لگاتار کوششوں کے بعد اس نے پیٹرو گراڈ میں ایک جماعت بنائی۔ اس کا نام اس نے "لیبر یونین" رکھا

اسی دوران میں اس نے ایک انقلابی پمفلٹ شائع کیا۔ مگر یہ حکومت نے ضبط کر لیا۔

لینن کی خطرناک سرگرمیوں کو دیکھ کر حکومت نے ۱۸۹۵ء میں اسے سائبیریا جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی کے ان ایام میں اس نے مارکسی لٹریچر سائنس اور فلسفے کا خوب مطالعہ کیا۔ ہیگل اور دیگر مفکرین کی تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لینن خود اسی زمانہ میں ایک کتاب "روس کی مجلسی آزادی کے وسائل" ضبطِ تحریر میں لایا۔ اس کتاب کے علاوہ اس نے ایک اور تصنیف بھی شائع کی جو عوام پر بہت اثر انداز ہوئی۔ اس نے ان کے دماغوں میں شخصیت، سرمایہ داری اور ساہوکاری کے خلاف منافرت کے جراثیم پیدا کر دیئے۔

کچھ عرصے کے بعد زار نے لینن کو روس واپس آنے کی اجازت دے دی مگر اس نے غیر ممالک میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دی اور ۱۹۰۵ء میں پہلی بالشویک کانگرس منعقد ہوئی۔ گویا روس میں انقلاب کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس کانگرس میں بالکل ابتدائی مراحل طے ہوتے اور لینن نے ثابت کیا کہ بالشویک ایک مضبوط چٹان کے مانند ہیں، جو اپنے عقائد میں ثابت قدم رہ کر ہر قسم کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں بمقام پریگ دوسری بالشویک کانگرس کا انعقاد ہوا جس سے تحریک میں دوبارہ زندگی پڑ گئی۔

اس دوران میں آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ فکر و مذہب کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا۔ ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو نکولس کے چچا پر دن کے وقت بم پھینکا گیا۔ انقلابیوں کا عام دستور ہو گیا تھا کہ جو شخص جبر و استبداد میں نمایاں حصہ لیتا اسے ہلاک کر

ڈالتے۔ نکولس نے انقلابی سرگرمیوں کی یہ رفتار دیکھ کر پارلیمنٹ کی ترتیب کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے اختیارات بہت محدود رکھے۔ تاہم پارلیمنٹ کے ارکان کی کثیر تعداد اپنے اختیارات کو بہتر سے بہتر طریق پر استعمال کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ ان کی طرف سے جو تجاویز بھی پیش کی گئیں، وہ وزیرِ اعظم نے مسترد کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو موقوف کر دیا گیا۔ یہ ۱۹۰۶ء کے واقعات ہیں۔ پارلیمنٹ موقوف کرنے کے بعد کسانوں اور مزدوروں کی دلداری کا کچھ سامان کیا گیا۔ مگر یہ نمائشی کھلونے انہیں رام نہ کر سکے۔

دوسری پارلیمنٹ ۱۹۰۶ء میں منعقد ہوئی۔ اسے متاثر و مرعوب کرنے کے لئے پولس نے زار کے قتل کی ایک فرضی سازش کا خاکہ تیار کیا اور اس طرح کوشش کی گئی کہ پارلیمنٹ کی رکنیت سے اشتراکیوں کو خارج کر دیا جائے۔ پارلیمنٹ نے اس فیصلے کی تائید سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اسے بھی موقوف کر دیا گیا۔

نومبر ۱۹۰۷ء میں نئے قانونِ انتخاب کے ماتحت تیسری پارلیمنٹ منتخب ہوئی۔ یہ پارلیمنٹ بھی استبداد کے لئے آرام کا کوئی سامان مہیا نہ کر سکی یہ صرف ۱۹۱۲ء تک قائم رہی۔ ۱۹۱۲ء میں دوبارہ انتخاب ہوا جس میں تقریباً پہلے ہی ارکان پھر منتخب ہوئے۔ بظاہر اصلاح کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک پارٹی اندر ہی اندر انقلاب کے لئے کوشاں تھی۔ تا آنکہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔

اس وقت لینن گلیشیا کے ایک گاؤں میں اقامت پذیر تھا۔ اس کے علاوہ زینوویف[1]

---

[1] یہ لینن کا رفیقِ کار تھا۔ حال ہی میں اسے کسی خاص اختلاف کی بنا پر جلا وطن کر دیا گیا ہے۔

کے سامنے یہ سوال حل طلب تھا کہ جرمنی کی اشتراکی جماعت کو اس یورپی جنگ کی مخالفت کرنا چاہئے یا نہیں۔ لینن کا خیال تھا کہ یہ جماعت جنگ کے خلاف رائے دے گی۔ لیکن زینوویف کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جرمن کی اشتراکی مجلس نے صاف لفظوں میں جنگ کی حمایت کی جس سے لینن کو سخت صدمہ پہنچا۔

دراصل لینن کی خواہش تھی کہ روس جنگ میں شکست کھائے اور صلح پر مجبور ہو اس لئے کہ روس کی شکست کے سوا انقلاب کو کامیاب بنانے کی کوئی اور شکل نہ تھی آخر ۱۹۱۷ء کے آغاز میں حالات نے نازک ترین صورت اختیار کر لی۔ ابتدا خالی معدے کی بغاوت سے ہوئی۔ لینن گراڈ کے ایک مجمع نے بھوک سے تنگ آکر نانبائیوں کی دوکانوں کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس نے ان پر گولیاں چلائیں۔ لیکن لینن گراڈ کے سپاہیوں نے پولیس کو مار کر ہٹا دیا۔ حوصلہ پاکر مجمع نے اسلحہ خانے پر حملہ کر دیا۔ جیل خانے کے دروازے توڑ ڈالے اور صدر کوتوالی میں آگ لگا دی۔ شام کو مختلف پارٹیوں کے نمائندے منتخب ہوئے۔ اور رودزیانکو کی صدارت میں ایک زبردست جلسہ منعقد کیا گیا۔ زار کو اس مضمون کے تار بھیجے گئے۔ ملک اور شاہی خاندان کے فیصلے کا آخری وقت آپہنچا ہے ـــ لیکن ان تاروں کا کوئی جواب نہ آیا۔ آخر کار رودزیانکو نے رفقاء کے کہنے پر ایک عارضی حکومت کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس عارضی حکومت میں کرنسکی وزیر عدالت تھا۔ یہ حالات دیکھ کر جب زار نے اپنے شاہی محل تک پہنچنے کی سعی کی تو راستہ رکا ہوا پایا اور جنرل روزکی کے ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا۔ یہاں اسے تخت سے دست بردار ہونے کے لئے کہا گیا۔ وہ اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر جب ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ اس کے بیٹے

کی بیماری لاعلاج ہے تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی مائیکل کو تخت نشین کرنا چاہا مگر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک تاج و تخت کو قبول نہیں کرے گا جب تک مجلس ملی اس پر رضا مند نہ ہو گی۔ یہ شاہی خاندان کے خاتمے کا اعلان تھا۔

۱۶ مارچ ۱۹۱۷ء کو مائیکل پر سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ عارضی حکومت نے نکولس کو اس کے محل میں قید کر کے باہر پہرے لگا دیئے۔

۱۹۱۷ء میں لینن چھپ چھپا کر دفعتہً پیٹروگراڈ آ پہنچا اور وہاں مساعدت حالات کی بنا پر عام انقلاب کرانے میں کامیاب ہوگیا اور ملک کا تمام نظام جمہور کے ہاتھ میں دے دیا۔ ۷ نومبر کو لینن نے ماسکو پر قبضہ کر لیا۔ کیرنسکی بھاگ کر بعد وقت انگلستان پہنچا۔ لینن کی پارٹی نے جو بالشویک[1] کہلاتی تھی، سارا نظامِ انتخاب بدل دیا۔ ایک مجلسِ ملی منتخب کی گئی۔ اس مجلس نے ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان منتخب کئے ان کا صدر لینن بن گیا —— زاریت مغلوب اور اشتراکیت غالب آئی۔

جب بالشویکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ شاہی خاندان کو بالسک سے الیکاترنبرگ لے آئے اور یہیں ۱۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو یوروزکی نامی ایک شخص نے بالشویک حکومت کے ایما پر سارے خاندان کو چند خادموں اور خادماؤں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لاشوں کو پٹرول ڈال کر جلایا گیا اور ان کی راکھ کانوں کی تہہ میں بکھیر دی گئی۔

لینن اور اس کے بعد بالشویک پارٹی نے روس کے نشو و ارتقا کے لئے جو

---

[1] بالشویک روسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کثرتِ تعداد کے ہیں۔

کچھ کیا اس کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ طویل مقالے کی ضرورت ہے۔ روس کے اصول و نظریات ۱۹۱۸ء کے مقابلے میں اس وقت بڑے معتدل ہیں۔ تقریباً تمام حکومتوں کے ساتھ اُس کے سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ اس وقت بالشویک روس ان تمام علاقوں پر قابض ہے جو زاروں کے زمانہ میں روس کے اجزا تھے۔ روس میں سولہ کروڑ آدمی اپنے پنج سالہ پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے روز و شب بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ بہت سی زائد اراضی مشترک ہو کر زیر کاشت لائی گئی ہیں۔ ان میں نئے وضع کے ہل چلا کر پیداوار کو بڑھایا گیا ہے۔ کروڑوں آدمی اپنے جوش میں نئے اشتراکی کام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ جنگِ عظیم سے پہلے ستر لاکھ بچے تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک کروڑ دس لاکھ تھے۔ مگر اب روس کا ہر فرد خواندہ ہے۔ ہر بچے کا خرچ حکومت برداشت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ کمانے کے لائق ہو جائے۔ اشتراکی روسی بچوں کی جماعت میں اپنے آئندہ کے حامی و اتحادی پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے شہریوں کے مفاد کو اشتراکی دولت کے مفاد سے ملا کر ہر فرد و بشر کو اس دولت کا ایک آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی صحت، تعلیم اور فراغت کی محافظ حکومت ہے۔ ماسکو کے قریب کے پبلک باغ میں ہر روز تقریباً ایک لاکھ سیر کرنے والوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

اشتمالیت نے روسی عورت کو اس کی صدیوں کی غلامی سے رہا کر دیا ہے۔ اب روس میں اشتمالی باورچی خانے ہیں۔ کھیتوں میں بچوں کی نگہداشت کا انتظام ہے۔ اب شادی کی بنا نہ مذہب پر ہے اور نہ کسی عدالتی معاہدے پر۔ گو اشتمالی خیال کے آدمی بدستور لا مذہب ہیں۔ علما و ادبا کی جماعت تخلیقی کام میں مصروف

ہے۔ اور بالعموم روسیوں کے پیشِ نظر ایک عظیم الشان مشترک مطمح نظر ہے جو انہیں ہر روز آگے بڑھائے لئے جاتا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ ایک نئی دنیا کی طرح ڈال رہے ہیں اور یہ کہ ان کی مساعی کے باعث نوعِ انسان کا مستقبل شاندار ہو جانے والا ہے۔ گو یہ کہا جاتا ہے کہ روحانیت کے بغیر اشتمالیت کا پودا پروان نہ چڑھے گا لیکن اس حقیقت کو کوئی دوست، دشمن نظر انداز نہیں کر سکتا کہ باوجود انتہائی مشکلات اور شدید مخالفت کے روس کو اپنے نئے تجربے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

روس کا موجودہ آمر مسٹر سٹالن اپنے ملک کی فضا کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنا رہا ہے۔

باتیں

بمبئی آیا تھا کہ چند روز پرانے دوستوں کے ساتھ گزاروں گا اور اپنے تھکے ہوئے دماغ کو کچھ آرام پہنچاؤں گا، مگر یہاں پہنچتے ہی وہ جھٹکے لگے کہ راتوں کی نیند تک حرام ہو گئی۔

سیاسیات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی۔ یہ دونوں پیشے ہیں۔ دوا فروش اور لیڈر دونوں دوسروں کے نسخے استعمال کرتے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔ گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں۔

خیر صاحب بمبئی پہنچا۔ وہی بازار تھے، وہی گلیاں تھیں، جن کے پتھروں پر پانچ برس میرے نقش قدم بکھرتے رہے تھے۔ وہی بمبئی تھی جہاں میں دو ہندو مسلم فساد دیکھ چکا تھا۔ وہی خوبصورت شہر تھا، جس کے اندر میں نے کئی بے گناہ مسلمانوں

اور ہندوؤں کے خون کے چھینٹے اڑتے دیکھے تھے۔ وہی جگہ تھی جہاں کانگرس نے امتناعِ شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزار ہا مزدوروں کو بے کار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے۔ وہی مقام تھا جہاں میں نے کئی دھوبیوں کو جو بارہ گھنٹے پانی میں کھڑے رہتے تھے، رات کو اپنے جسم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے زہریلی اسپرٹ پیتے دیکھا تھا ـــــ وہی عروس البلاد تھی جس کے گھونگھٹ کا ایک حصّہ حریری ہے۔ اور دوسرا بورئیے اور کھردرے ٹاٹ کا ـــــ وہی بمبئی تھا جہاں اونچی اونچی خوبصورت عمارات کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزار ہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔

○

میں نے بس میں سوار ہوتے ہوئے ایک عورت کو دیکھا۔ پھر دیکھا ـــــ اب کے غور سے دیکھا ـــــ آہ، حقیقت میرے سامنے تھی ان کالے حلقوں کی صورت میں جو اس لڑکی کی شربتی آنکھوں کے نیچے پڑے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا (نام نہیں بتاؤں گا) یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ...... ؟ میں نے اس لڑکی کو دلّی میں دیکھا تھا۔ مغلوں کی دلّی میں جنہیں مقبرے بنانے کا بہت شوق تھا۔ کتنی بھولی بھالی تھی۔ صرف دس مہینے پہلے وہ کس قدر معصوم تھی۔ میں اس سے ڈر کے مارے بات تک نہ کرتا تھا۔ میں اس کو دیکھتا تھا تو مجھ پر رعب سا طاری ہو جاتا تھا۔ مگر اب میں نے اسے دیکھا تو مجھے اس کے اور اپنے درمیان کوئی چیز بھی حائل محسوس نہ ہوئی۔ میں نے اس کے کاندھے پر بے دھڑک ہاتھ رکھ کر اس سے پوچھا "کہو کیسی گزر رہی ہے" اس کی آنکھوں میں ایک دھندلی سی چمک پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دیا جو کبھی مندر میں جلتا تھا، اب دیر سے کسی ولیٹیل کے

گھر میں چل رہا ہے۔ دیر سے بہت دیر سے...... یہ بمبئی کتنی لڑکیوں کو عورتوں میں تبدیل کر چکا ہے؟........ عصمت کی حفاظت ضروری ہے مگر پیٹ کی بھوک مٹانا بھی ضروری ہے۔ یہاں بمبئی میں آکر معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو بھوک بھی لگتی ہے۔

○

دو ہندو مسلم فساد اس شہر میں دیکھ چکا ہوں، بنا ئے فساد وہی تھی، پرانی!
مندر اور مسجد ___ گائے اور سؤر۔ مندر اور مسجد اینٹوں کا ڈھیر، گائے اور سؤر، گوشت کا ڈھیر ___ پر اس دفعہ ایک نیا فساد دیکھنے میں آیا۔ ہندو مسلم فساد نہیں، مندر اور مسجد کا جھگڑا نہیں، گائے اور سور کا قضیہ نہیں، ایک نئے قسم کا ہلڑ، ایک نئے قسم کا طوفان جو بمبئی میں قریباً چھ روز مچا رہا۔

○

ایک روز ٹیلی فون پر کسی صاحب نے مجھے بتایا کہ رات رات میں کانگرس کے تمام لیڈر گرفتار کر لئے گئے، گاندھی جی سمیت جو کانگرس کے ممبر نہیں ہیں... میں نے کہا اچھا بھئی، گرفتار کر لئے گئے ہیں تو ٹھیک ہے، یہ لوگ گرفتار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے کوئی اچنبھا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک دوست نے رنگ کیا تو معلوم ہوا کہ شہر بھر میں ہلڑ مچ گیا ہے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا ہے گولی چلائی ہے۔ فوج بلائی گئی ہے۔ بازاروں میں ٹینک چل رہے ہیں.....
دو تین روز تک میں گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ اخبار پڑھتا رہا اور لوگوں سے بھانت بھانت کی خبریں سنتا رہا۔

مسلم لیگ مسجد ہے، کانگریس مندر ہے۔ لوگوں کا یہی خیال ہے۔ اخبار بھی یہی کہتے ہیں، کانگریس سوراج چاہتی ہے، مسلم لیگ بھی۔ لیکن دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔ دونوں مل جل کر کام نہیں کرتے۔ اس لئے کہ مندر اور مسجد ساخت کے اعتبار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ میرا خیال تھا کہ یہ جو فساد ہو رہا ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہو جائیں گے۔ اور ان دونوں کے خون کا ملاپ جو مندروں اور مسجدوں میں نہیں ہوتا۔ موریوں اور بدروؤں میں ہوگا۔ مگر مجھے بہت تعجب ہوا، جب میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔

○

ماہم کی طرف ایک لمبی سڑک جاتی ہے۔ سڑک کے آخری سرے پر مسلمانوں کی مشہور خانقاہ ہے مسلمان مردہ پرست مشہور ہیں۔ جب بلوہ شروع ہوا اور شہر کے اس حصے تک پہنچ گیا۔ لڑکوں اور بچوں نے فٹ پاتھ کے درخت اکھیڑ اکھیڑ کر بازار میں رکھنے شروع کئے تو ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ چند ہندو لڑکے لوہے کا ایک جنگلہ گھسیٹ کر اس طرف لے جانے لگے۔ جدھر خانقاہ سے چند مسلمان آگے بڑھے، ان میں سے ایک نے بڑی آہستگی سے ان لڑکوں سے کہا۔ "دیکھو بھئی ادھر مت آؤ ــــ یہاں سے پاکستان شروع ہوتا ہے۔" سڑک پر ایک لکیر کھینچ دی گئی۔ چنانچہ بلوہ پسند لڑکے چپ چاپ اس جنگلے کو اٹھا کر دوسری طرف لے گئے کہتے ہیں کہ "پاکستان" کی طرف پھر کسی کافر نے رخ نہ کیا۔

○

بھنڈی بازار مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں کوئی شورش نہ ہوگی۔ مسلمان وہ

مسلمان جو ہندو مسلم فساد میں سب سے پیش پیش ہوتے تھے اب ہوٹلوں میں چار کی پیالیاں سامنے رکھ کر فساد کی باتیں کرتے تھے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے۔ میں نے ایک مسلمان کو اپنے دوست سے کہتے سنا، "ہمارے جناح صاحب دیکھیے ہمیں کب آرڈر دیتے ہیں۔"

○

اسی بلوے کا ایک لطیفہ سنئے:۔

ایک سڑک پر ایک انگریز اپنی موٹر میں جا رہا تھا۔ چند آدمیوں نے اس کی موٹر روک لی۔ انگریز بہت گھبرایا کہ نہ معلوم یہ سرپھرے لوگ اس کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے۔ مگر اس کو حیرت ہوئی جب ایک آدمی نے اس سے کہا دیکھو۔ "دیکھو، اپنے شوفر کو پیچھے بٹھاؤ اور خود اپنی موٹر ڈرائیو کرو ــــ تم نوکر بنو اور اس کو اپنا آقا بناؤ۔"

انگریز پیچھے سے اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ اس کا شوفر بوکھلایا ہوا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا ــــ بلوہ پسند لوگ اتنی سی بات پر خوش ہو گئے۔ انگریز کی جان میں جان آئی کہ چلو سستے چھوٹ گئے۔

○

ایک جگہ بمبئی کے ایک اُردو فلمی اخبار کے ایڈیٹر صاحب پیدل جا رہے تھے۔ بل وصول کرنے کی خاطر انہوں نے سوٹ بوٹ پہن رکھا تھا۔ ہیٹ بھی لگی تھی۔ ٹائی بھی موجود تھی۔ چند فسادیوں نے انہیں روک کر کہا "یہ ہیٹ اور ٹائی اتار کر ہمارے حوالے کر دو۔" ایڈیٹر صاحب نے ڈر کے مارے یہ دونوں چیزیں ان کے حوالے

کر دیں۔ جو فوراً دہکتے ہوئے الاؤ میں جھونک دی گئیں۔ اس کے بعد ایک نے ایڈیٹر صاحب کا سوٹ دیکھ کر کہا۔ "یہ بھی تو انگریزی ہے، اسے کیا نہیں اتروانا چاہئے" ایڈیٹر صاحب سٹپٹائے کہ اب کیا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ ان لوگوں سے کہا۔ "دیکھو، میرے پاس صرف یہی ایک سوٹ ہے جسے پہن کر میں فلم کمپنیوں میں جاتا ہوں اور مالکوں سے مل کر اشتہار وصول کرتا ہوں۔ تم اسے جلا دو گے تو میں تباہ ہو جاؤں گا، میری ساری بزنس برباد ہو جائے گی۔"

ایڈیٹر صاحب کی آنکھوں میں جب ان لوگوں نے آنسو دیکھے تو پتلون اور اور کوٹ اُن کے بدن پر سلامت رہنے دیا۔

○

جس محلے میں رہتا ہوں، وہاں کرسچین زیادہ آباد ہیں۔ ہر رنگ کے کرسچین، سیاہ فام کرسچینوں سے لے کر گورے چٹے تک آپ کو تمام شیڈ یہاں مل جائیں گے جامنی رنگ کے کرسچین بھی میں نے یہاں دیکھے ہیں، جو خود کو ہندوستان کی فاتح قوم یعنی انگریزوں میں شمار کرتے ہیں۔

اس بلوے میں ان لوگوں کا میں نے بُرا حال دیکھا۔ پتلونوں میں مردوں کی اور سکرٹس میں عورتوں کی ننگی ٹانگیں کانپتی تھیں جب فساد کی خبریں آتی تھیں ـــ ڈر کے مارے مردوں نے ہیٹ لگانے چھوڑ دیئے، ٹائیاں گلے سے الگ کر دیں۔ عورتوں نے سکرٹس اور فراک پہننے چھوڑ دیئے اور ساڑھیاں پہننا شروع کر دیں۔

○

ہندو مسلم فساد کے دنوں میں ہم لوگ جب باہر کسی کام سے نکلتے تھے تو اپنے

ساتھ دو ٹوپیاں رکھتے تھے۔ ایک ہندو کیپ، دوسری رومی ٹوپی۔ جب مسلمانوں کے محلے سے گزرتے تھے تو رومی ٹوپی پہن لیتے تھے اور جب ہندوؤں کے محلے میں جاتے تھے تو ہندو کیپ لگا لیتے تھے ـــــ اس فساد میں ہم لوگوں نے گاندھی کیپ خریدی۔ یہ ہم جیب میں رکھ لیتے تھے جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جھٹ سے پہن لیتے تھے ـــــ پہلے مذہب سینوں میں ہوتا تھا آج کل ٹوپیوں میں ہوتا ہے۔ سیاست بھی اب ٹوپیوں میں چلی آئی ہے ـــــ زندہ باد ٹوپیاں!

○

میرے سامنے دیوار پر ایک کلاک آویزاں ہے ـــــ ابھی ابھی اس نے بارہ بجائے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چار بجے ہیں۔ جب چار کا وقت ہوگا تو یہ بارہ بجائے گا۔ اس میں کوئی خرابی واقع ہوگئی ہے۔ میں نے اب سوچنا شروع کیا ہے تو مجھے اس کلاک میں اور ہمارے عوام کی موجودہ حالت میں صدگونہ مماثلت نظر آتی ہے۔ کلاک کی طرح ان کے کل پرزوں میں بھی کوئی خرابی ہے۔ یوں تو کلاک کی سوئیوں کی طرح وہ اپنا کام ٹھیک کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فعل اور اس کے ظاہری نتیجہ میں بہت تضاد ہوتا ہے، بالکل اس کلاک کے مانند جو بارہ کے عمل پر چار دفعہ ٹن ٹن کرتا ہے اور چار بجنے پر بارہ دفعہ ٹن ٹن کرتا ہے۔

لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں؟

اس حقیقت کی کیا توضیح ہو سکتی ہے کہ لوگ ایسی اشیاء استعمال میں لاتے ہیں جو انہیں بے خود و مدہوش بنا دیں۔ مثال کے طور پر شراب، بیئر، چرس گانجا افیم تمباکو اور دوسری چیزیں جو زیادہ عام نہیں مثلاً ایتھر، مارفیا وغیرہ وغیرہ..... ان منشیات کا استعمال کیوں شروع ہوا؟...... ان کا استعمال اتنی جلدی کیوں عام ہو گیا ہے۔ مہذّب اور غیر مہذّب لوگوں میں ان کی کھپت کیوں روز بروز بڑھ رہی ہے؟...... یہ کیا بات ہے کہ جہاں شراب یا بیئر نہیں ملتی وہاں افیم گانجا اور چرس وغیرہ کا استعمال عام ہے اور تمباکو دنیا کے ہر کونے میں پیا جاتا ہے۔

لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں؟

آپ کسی سے یہ سوال پوچھئے کہ اس نے کیوں پینا شروع کی اور یہ کہ اب وہ کیوں پیتا ہے تو وہ غالباً یہ جواب دے گا "شراب بڑی خوش گوار چیز ہے... اور.... پھر سبھی تو پیتے ہیں" شاید وہ یہ بھی کہے "میں پیتا ہوں اس لئے کہ مجھے

اس سے فرحت حاصل ہوتی ہے"! اور وہ لوگ جنہوں نے آج تک اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ شراب بری چیز ہے یا اچھی، اپنے جواب میں یہ کہیں گے کہ وہ صحت قائم رکھنے کے لئے شراب پیتے ہیں ...... یہ ایک ایسا بیان ہے جو آج سے بہت عرصہ پہلے بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔

کسی تمباکو پینے والے سے پوچھئے کہ حضرت آپ نے کس ضرورت کے ماتحت تمباکو پینا شروع کیا۔ اور اب آپ تمباکو کیوں پیتے ہیں۔ تو اس کا جواب بھی کچھ اس قسم کا ہوگا۔ "وقت کاٹنے کے لئے ہر شخص تمباکو پیتا ہے"!

وقت کاٹنے کے لئے، فرحت حاصل کرنے کے لئے ...... وقت کاٹنے کے لئے فرحت حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی اپنی انگلیاں چٹخائے، سیٹی بجائے کچھ گنگنائے یا اسی قسم کی کوئی اور چیز کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے نیچر کی دولت ضائع نہیں ہوتی اور نہ کوئی ایسی چیز ہی خرچ ہوتی ہے، جس کے بنانے پر بے شمار سرمایہ اور محنت صرف ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اس سے نہ اپنے آپ کو اور نہ دوسروں کو کوئی دکھ ہی پہنچتا ہے لیکن تمباکو چرس شراب اور افیم بنانے پر لاکھوں آدمیوں کی محنت خرچ ہوتی ہے اور کروڑوں ایکڑ زمین بھنگ، پوست، انگور اور تمباکو کی کاشت کے لئے وقف کر دی جاتی ہے۔ علاوہ بریں یہ مسلمہ نقصان دہ چیزیں نہایت ہی خطرناک برائیاں پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور لوگوں کو متعدی امراض اور جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ و برباد کرتی ہیں۔ یہ تمام حقائق روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا استعمال "وقت کاٹنے کے لئے، فرحت حاصل کرنے کے لئے" ہرگز

ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ یہ بہانہ ہی چل سکتا ہے کہ "ہر شخص پیتا ہے۔"

ان کے استعمال کی کوئی اور ہی وجہ ہے۔

ہم ہر روز ایسے آدمیوں سے ملتے ہیں جو اپنے بال بچوں سے محبت کرتے ہیں اور جو ان کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں، لیکن وہ اس کے باوصف شراب بھنگ افیون یا چرس پر اتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں جو ان کے غربت زدہ اہل و عیال کی حالت بہتر بنا سکتا ہے یا کم از کم ان کو افلاس سے نجات دلا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اہل و عیال کی ضروریات اور ان کی مشکلات پر مدہوش کرنے والی چیزوں کو ترجیح دیتا ہے تو کوئی اور ہی معقول وجہ کارفرما ہوتی ہے۔ یہاں "وقت کاٹنے، فرحت حاصل کرنے کے لئے اور ہر شخص پیتا ہے" کی دلیل عائد نہیں ہو سکتی۔ کوئی ٹھوس وجہ اس فعل کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ ٹھوس وجہ ...... جیسا کہ میں نے اس موضوع پر کتابیں پڑھ کر دوسرے لوگوں کا مشاہدہ کرکے اور خاص طور پر اپنی اس حالت کا اندازہ کرنے کے بعد جب میں شراب اور تمباکو پیا کرتا تھا، سوچا ہے، مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی زندگی پر نظر کرے تو اکثر اوقات وہ اپنے اندر دو ہستیاں موجود پائے گا۔ ایک اندھی اور جسمانی ہے۔ دوسری بصارت کی مالک ہے یعنی روحانی۔ اول الذکر اندھا حیوانی وجود کھاتا ہے، پیتا ہے، آرام کرتا ہے، سوتا ہے بڑھتا ہے حرکت کرتا ہے، بالکل کوک بھری مشین کے مانند۔ اور روحانی وجود جو کہ دیکھتا ہے یعنی بصارت کا مالک ہے، حیوانی وجود سے بندھا ہوا ہے، یہ

اپنے آپ کچھ نہیں کرتا۔ صرف اپنے ساتھی کی حرکات جانچتا رہتا ہے۔ جب یہ حیوانی وجود کے کسی عمل کو پسند کرتا ہے تو اس کے اندر گھل مل جاتا ہے۔ اور جب یہ اس کے کسی عمل کو ناپسند کرتا ہے، تو اس سے الگ ہو جاتا ہے۔

اس مشاہدہ و ملاحظہ کرنے والے وجود کی تشبیہہ کمپاس کی سوئی سے دی جا سکتی ہے۔ جس کا ایک سرا شمال کی طرف اور دوسرا سرا جنوب کی طرف رہتا ہے۔ ہم کو اصل نقطے اور اس سوئی کا فرق صرف اسی صورت میں معلوم ہوتا ہے، اگر ہم غلط سمت جا رہے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح روحانی وجود (جس کے اظہار کو ہم عام طور پر ضمیر کہتے ہیں) کا ایک سرا برائی کی طرف رہتا ہے اور دوسرا سرا اچھائی کی طرف۔ اس روحانی وجود کی موجودگی سے باخبر ہونے کے لئے ہمیں کوئی ایسا فعل کرنا پڑے گا، جو ضمیر کے خلاف ہو کیونکہ حیوانی وجود کا رخ اس مقام سے ہٹ جائے گا جس کی طرف ضمیر اشارہ کرتا رہتا ہے۔

جس طرح وہ جہاز ران جو اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ غلط رستے پر جا رہا ہے، جب تک کمپاس کے مطابق اپنا رخ ٹھیک نہ کر لے یا اپنی غلطی کے احساس کو قطعی طور پر نہ مٹا دے، چپو نہیں چلا سکتا اور نہ بادبانوں ہی سے کام لے سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ انسان جو اپنے حیوانی وجود کی حرکات اور ضمیر کی آواز کی دوئی سے آگاہ ہو، صرف اس صورت میں اپنا کام جاری رکھ سکتا ہے: اگر وہ اسے ضمیر کے مطالبات کے ساتھ ہم آہنگ و منضبط کر دے۔ یا پھر ان اشارات سے بالکل غافل ہو جائے جو ضمیر اس کے حیوانی وجود کی غلط روی پر اس تک پہنچاتا ہے۔

انسانی زندگی ان دو سرگرمیوں یا عامل قوتوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ اپنے افعال کو ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ کرنا۔

۲۔ ضمیر کی آواز پر اپنے کان بند کر لینا تاکہ حسبِ معمول زندگی بسر کی جا سکے۔

بعض حضرات پہلی بات پر عمل کرتے ہیں۔ اور بعض دوسری پر۔ اوّل الذکر بات صرف اخلاقی روشنی سے حاصل ہوتی ہے اور آخر الذکر بات کے لئے یعنی ضمیر کی آواز پر اپنے کان بند کر لینے کے لئے دو ذریعے ہیں۔ ایک خارجی اور ایک اندرونی۔ خارجی ذریعہ یہ ہے کہ خود کو ایسے مشاغل میں مصروف رکھا جائے جو ہماری توجہ ضمیر کے اشارات سے ہٹائے رکھیں اور اندرونی ذریعہ یہ ہے کہ خود ضمیر ہی کی روشنی کو آہستہ آہستہ گل کر دیا جائے اور اس میں اندھیرا پیدا کر دیا جائے۔

اپنے سامنے کی چیزوں کو نہ دیکھنے کے لئے انسان کے پاس دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ نگاہیں ہٹا کر کسی دوسری چیز کو دیکھنا شروع کر دیا، جو زیادہ جاذبِ نظر ہوں اور دوسرا یہ کہ اپنی آنکھوں کی بصارت کو مسدود کر دیا جائے، اسی طرح انسان ضمیر کی آواز پر اپنے کان دو طریقوں سے بند کر سکتا ہے۔ پہلا طریقہ خارجی ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی توجہ مختلف مشاغل تفکرات کھیلوں وغیرہ کی طرف مبذول کر دے اور دوسرا طریقہ اندرونی ہے یعنی یہ کہ وہ توجہ پیدا کرنے والے عضو ہی کو معطل کر دے۔

ان لوگوں کے لئے جن کی قوتِ احساس کند ہوتی ہے اور جن کے اخلاقی احساسات محدود ہوتے ہیں، بیرونی تفریحات اکثر اوقات اس بات کے لئے کافی ہوتی ہیں کہ وہ ضمیر کے اشارات نہ سمجھیں۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جو اخلاقی طور پر کافی حساس ہوتے ہیں، ایسی تفریحات بالکل ناکافی ہوتی ہیں۔

بیرونی ذرائع پورے طور پر شعور اور ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتے اور نہ وہ شعور کے مطالبات ہی سے ہمیں قطعی طور پر غافل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے

کہ یہ احساس یہ شعور ہماری زندگی میں روڑے اٹکانا شروع کر دیتا ہے۔ اب لوگ جو اپنے دن حسبِ سابق گزارنا چاہتے ہیں، اندرونی قابلِ اعتماد طریقے کو استعمال کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ضمیر ہی کو تاریک بنا دیا جائے، چنانچہ اس کام کے لئے وہ دماغ کو مدہوش بنانے والی چیزوں سے زہر آلود کرتے ہیں۔

(۲)

شراب، افیم، چرس، بھنگ اور تمباکو کا عالمگیر استعمال اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں فرحت یا دل بستگی کا سامان مہیا کرتی ہیں، بلکہ ان کا استعمال صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ضمیر کے مطالبات سے خود کو چھپا لیا جائے۔

میں ایک روز بازار میں جا رہا تھا۔ میرے پاس سے دو گاڑیبان گزر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "بے شک جب ہم ہوش میں ہوں تو ایسا کرتے ہوئے ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے"۔ جب آدمی ہوش میں ہو تو اسے کوئی خاص کام کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اور جب وہ شراب میں مخمور ہو تو اسے وہی کام ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں وہ وجہ پوشیدہ ہے جو انسانوں کو مدہوش بنانے والی اشیاء کی طرف راغب کرتی ہے۔ لوگ ان اشیاء کو یا تو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ شرم کے ان احساسات کو دبا دیں جو کسی غلط کام کرنے پر پیدا ہوتے ہیں یا پہلے ہی سے خود پر ایسی حالت طاری کر لیں جس میں وہ ضمیر کے خلاف کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے حیوانی وجود کی اطاعت کر سکتے ہیں۔

ہوش کی حالت میں مرد فاحشہ کے مکان پر جانے سے ڈرتا ہے۔ چوری کرنے سے خوف کھاتا ہے اور کسی کو قتل کرنے کی جرأت نہیں کرتا لیکن یہ تمام کام کرتے

ہوئے شرابی کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا چاہیے تو اسے خود کو مدہوش کرنا پڑتا ہے۔

مجھے اس باورچی کا بیان یاد آجاتا ہے جس نے میری ایک بوڑھی رشتہ دار کو قتل کر دیا تھا۔ اس نے عدالت میں کہا تھا کہ جب اس نے اپنی داشتہ (ایک نوکرانی) کو باہر بھیج دیا اور کام کرنے کا وقت قریب آگیا تو اس نے چاقو لے کر کمرۂ خواب میں جانا چاہا، لیکن اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہوش کی حالت میں وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ وہ لوٹا اور "ووڈکا" کے دو گلاس پینے کے بعد اس نے خود کو قتل کے لئے بالکل تیار پایا، چنانچہ اس نے کمرے میں جاکر بڑھیا کو ہلاک کر دیا۔ یہاں اسی گاڑیبان کی بات یاد آجاتی ہے کہ جب ہم ہوش میں ہوں تو ایسا کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

دس میں سے نو جرم اسی طریقے پر کئے جاتے ہیں، یعنی اس بات پر عمل کیا جاتا ہے "ہمت حاصل کرنے کے لئے شراب پیو!"

وہ عورتیں جو اپنی عصمت کھوتی ہیں، ان میں سے پچاس فی صدی ایسی ہوتی ہیں جو شراب کے نشے میں اپنی زندگی کا بہترین زیور اتار کر پھینک دیتی ہیں۔ دلیشیاؤں کے ہاں اکثر وہی لوگ جاتے ہیں جو شرابی ہوں۔ چونکہ لوگ شراب کے اس اثر سے واقف ہیں کہ یہ ضمیر کی آواز بالکل دبا دیتی ہے، اس لئے وہ اسے جان بوجھ کر اسی کام کے لئے پیتے ہیں۔

لوگ صرف اپنے ضمیر ہی کی آواز دبانے کے لئے شراب نہیں پیتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ضمیر سے غافل کرنے کے لئے شراب پلاتے ہیں۔ جنگ میں، دو بدو لڑائی

کے وقت فوجیوں کو عام طور پر شراب پلائی جاتی ہے۔ سبستوپول پر جب فرانسیسی فوجیوں نے حملہ کیا تھا تو وہ سب کے سب مخمور تھے۔

جب کسی جگہ پر قبضہ کیا جاتا ہے اور فوجی وہاں کے بے یار و مددگار بچوں اور بوڑھوں کو مارنے سے انکار کر دیتے ہیں تو عام طور پر ان کو شراب سے مدہوش کرنے کے احکام جاری کئے جاتے ہیں، مخموری کی حالت میں وہ اس کام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، رجحان سے بچا جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کی کئی مثالیں موجود ہیں، جنہوں نے کوئی غلط کام کرنے کے بعد شراب نوشی شروع کی۔ چونکہ وہ اپنی ندامت دور کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے خود کو مدہوش بنانا شروع کر دیا۔ اور پھر سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو بُری زندگی بسر کرتے ہیں، منشیات کی طرف جلد راغب ہوتے ہیں۔ چور اچکے رہزن اور روسیاہیں بغیر شراب کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔

ہر شخص یہ جانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کا استعمال باعث ہے ضمیر کی ٹیسیں۔ اور یہ کہ زندگی کے غیر اخلاقی رستوں پر چلتے وقت مدہوش بنانے والی اشیاء کا استعمال صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ضمیر کو گُنگ بنا دیا جائے اور یہ بھی ہر شخص پر واضح ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کا استعمال ضمیر کو گُنگ بنا دیتا ہے اور یہ کہ مخموری کی حالت میں آدمی وہ فعل بھی کر گزرتا ہے، جو ہوش کی حالت میں وہ کبھی نہیں کر سکتا، بلکہ یوں کہیئے کہ جس کا اسے کبھی قیاس بھی نہیں ہو گا۔ ہر شخص ان باتوں کو تسلیم کرتا ہے، مانتا ہے لیکن جب مدہوش بنانے والی اشیاء، چوری چکاری قتل و غارت یا تشدد پر منتج نہیں ہوتیں۔ جب ان کو کسی بھیانک جرم کے بعد

استعمال نہیں کیا جاتا۔ جب ان کو ایسے لوگ استعمال میں لاتے ہیں جو مجرم نہیں ہوتے اور جب ایسی چیزیں تھوڑی تھوڑی مقدار میں استعمال کی جاتی ہیں تو عام طور پر کسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مدہوش بنانے والی اشیا ضمیر کو کند نہیں بناتیں، چنانچہ اسی خیال کے ماتحت یہ کہا جاتا ہے کہ تھوڑی مقدار میں شراب، بیئر افیون وغیرہ صرف فرحت حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اور یوں ان کا ضمیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب معمولی مدہوشی کے بعد کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا جاتا، نہ چوری کی جاتی ہے اور نہ قتل کیا جاتا ہے، تو وہ بیہودہ اور فضول حرکات جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا مدہوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بخود وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ جرائم سے متعلقہ قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے، تو انہیں اپنے ضمیر کی آواز دبانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو سکتی اور یہ کہ وہ زندگی جو منشیات کے عادی بسر کرتے ہیں، بڑی اچھی زندگی ہوتی ہے اور اگر وہ اس عادت کو چھوڑ دیں تو بھی ان کی زندگی ویسی ہی اچھی رہ سکتی ہے یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ مدہوش بنانے والی چیزوں کا متواتر و مسلسل استعمال ان کے ضمیر کو قطعی طور پر تاریک نہیں بناتا۔

گو ہر شخص تجربے کی بنا پر جانتا ہے کہ شراب اور تمباکو سے انسان کے دل و دماغ کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے، ان چیزوں کے استعمال سے ان افعال پر شرم محسوس نہیں ہوتی، جن پر ہوش کی حالت میں ہونی چاہیئے۔ ضمیر کی ہر خلش پر انسان کسی مدہوش بنانے والی چیز کی طرف رجوع کرتا ہے۔ نشے کی حالت میں اپنی زندگی اور اپنی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتا، منشیات کا باقاعدہ اور مسلسل استعمال وہی نفسیاتی اثر پیدا کرتا ہے جو ان کا غیر معتدل اور بے قاعدہ استعمال پیدا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ان

لوگوں کو جو تمباکو اور شراب اعتدال سے پیتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ منشیات اپنے ضمیر کو کند بنانے کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ صرف ذائقے اور فرحت کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کو غیر جانبدارانہ طریقے پر بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے۔ ایسے نہیں سوچنا چاہیئے گویا سر کی بلا ٹال دی گئی ہے۔ بلکہ اس کو سمجھنا چاہیئے۔ اوّلاً یہ کہ جب منشیات زیادہ مقدار میں باقاعدہ استعمال کی جائیں تو ضمیر کو کند بنا دیتی ہیں تو ان کا تھوڑی مقدار میں باقاعدہ استعمال بھی ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہوگا، ثانیاً یہ کہ تمام منشیات، ضمیر کو کند بنانے کی خاصیت رکھتی ہیں، دونوں حالتوں میں ان کی یہ خاصیت برقرار رہتی ہے، خواہ ان کے اثر کے تحت ایسے الفاظ زبان پر آئیں، یا ایسے احساسات دل میں پیدا ہوں جو ہوش کی حالت میں پیدا نہیں ہونے چاہیئے تھے، اور ثالثاً یہ کہ اگر چوروں، ڈاکوؤں اور ویشیاؤں کو اپنے ضمیر کند کرنے کے لئے منشیات کی حاجت ہوتی ہے تو ان لوگوں کو بھی جو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام یا پیشہ اختیار کرتے ہیں (خواہ یہ کام اور پیشے آپ کے نزدیک بڑے باوقار اور موزوں ترین ہوں) ان چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مختصر الفاظ میں ہم اس حقیقت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کر سکتے کہ منشیات کا استعمال خواہ وہ تھوڑی مقدار میں اور باقاعدہ ہو۔ یا زیادہ مقدار میں اور بے قاعدہ۔ اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں۔ صرف ایک ہی ضرورت کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور وہ ضرورت ضمیر کی آواز کو دبانے کی ہے تاکہ راستے میں کوئی حائل نہ ہو۔

(۳)

صرف ان چند الفاظ میں منشیات و مسکرات اور تمباکو (جو عام پیا جاتا ہے اور جو سب سے زیادہ مضرت رساں ہے) کے عالمگیر استعمال کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تمباکو تازگی بخشتا ہے، خیالات کو صاف کرتا ہے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف ایسے ہی مبذول کرتا ہے جیسے دوسری چیزیں۔ اور یہ کہ شراب کے مانند اس کا ضمیر پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر بڑے غور سے ان حالتوں کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے جن میں تمباکو پینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ضمیر پر تمباکو کا وہی اثر ہوتا ہے جو شراب کا ہوتا ہے۔ اگر تمباکو واقعی تازگی بخشنے یا خیالات صاف کرنے والا ہوتا تو اس کی شدید طلب ہرگز ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ ایسی طلب جو خاص خاص مواقع پر نمودار ہو اور لوگ یہ ہرگز ہرگز نہ کہتے کہ ہم بھوکے رہ سکتے ہیں لیکن تمباکو ضرور پئیں گے۔

اس باورچی نے جس نے اپنی مالکہ کو قتل کر دیا تھا، کہا تھا کہ جب کمرہ خواب میں داخل ہو کر اس نے بڑھیا کے گلے پر چھری پھیر دی اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے تو اس کی ہمت، اس کی طاقت جواب دے گئی۔ "میں اپنا کام پوری طرح ختم نہ کر سکا۔" اس نے عدالت میں بیان دیا۔ "چنانچہ کمرے سے باہر نکل کر میں نے سگرٹ سلگایا۔"

سگرٹ پی کر اور خود کو مدہوش کرنے کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ واپس جا کر بڑھیا کے سر کو تن سے جدا کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کے دل میں سگرٹ پینے کی خواہش اس لئے پیدا نہ ہوئی کہ وہ اپنے خیالات کو صاف کرنا چاہتا تھا یا فرحت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس وقت اس کو اپنی وہ چیز کند بنانا تھی، جو اس

بُرے کام کی تکمیل سے روک رہی تھی۔

ہر تمباکو نوش تھوڑے سے غور و فکر کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ ایسے خاص لمحات آتے ہیں جب وہ خود کو تمباکو سے مدہوش بنانا چاہتا ہے، ان دونوں کو پیشِ نظر رکھ کر جب میں تمباکو کو پیا کرتا تھا میں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ جب مجھے اس کی طلب محسوس ہوا کرتی تھی۔ عام طور پر میں ایسے لمحات میں تمباکو پیا کرتا تھا جب کسی بات کی یاد کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ جب میں کسی چیز کو بھول جانا چاہتا تھا یا سرے ہی سے غور و فکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں بے کار بیٹھا ہوتا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے کام کرنا ہے۔ لیکن چونکہ میں ایسے ہی بے کار بیٹھا رہنا چاہتا تھا اس لئے میں تمباکو پینا شروع کر دیتا تھا۔ میں نے کسی کے ساتھ وعدہ کیا ہوتا تھا کہ میں اس کے یہاں پانچ بجے ضرور آؤں گا لیکن جب یہ وعدہ پورا نہ ہوتا تو اس کے احساس کو بھلانے کے لئے میں تمباکو پینے لگ جاتا۔ طبیعت میں چڑچڑے پن کے باعث میں اگر کسی کو ناخوشگوار کلمات کہہ دیتا تو اس غلطی کے احساس کو دور کرنے کے لئے پائپ منگا لیا کرتا تھا۔ تاش کھیلنے کے دوران میں اگر میں توقع سے زیادہ رقم ہار جاتا تو تمباکو پینا شروع کر دیتا تھا۔ مجھ سے اگر کوئی بُری حرکت سرزد ہو جاتی تھی اور اس کا اعتراف کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا تو پائپ پینے لگ جاتا تھا اور دوسروں کو قصوروار ٹھیرانا شروع کر دیتا تھا۔ کوئی مضمون لکھتے وقت اگر مجھے پوری طرح تسکین حاصل نہیں ہوتی تھی اور ہونا یہ چاہئیے تھا کہ میں لکھنا ترک کر دوں۔ لیکن میں زبردستی اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں تمباکو نوشی شروع کر دیتا تھا۔ کسی سے گفتگو کرتے وقت اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ہم

دونوں ایک دوسرے کی بات کو نہیں سمجھ رہے ۔ لیکن چونکہ میں اپنی رائے کا اظہار ری رکھنا چاہتا تھا ۔ اس لئے میں تمباکو پینا شروع کر دیتا تھا ۔

تمباکو اور دوسری مدہوش بنانے والی چیزوں میں یہ امتیازی فرق ہے کہ اس کے ذریعے ہم بڑی آسانی کے ساتھ خود کو مدہوش بنا سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کا بظاہر بالکل بے ضرر اور نقل پذیر ہوتا ہے ۔ افیم بھنگ اور شراب وغیرہ استعمال کرنے کے لئے ابتدائی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں ۔ اور دیگر لوازمات کی بھی ضرورت ہوتی ہے مگر تمباکو ہر وقت جیب میں رکھا جا سکتا ہے اور اس کے پینے کے لئے اور لوازمات کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ شراب اور گانجا پینے والوں کو دیکھ کر عام طور پر لوگ ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ لیکن تمباکو پینے والے اس قسم کی کیفیت پیدا نہیں کرتے ۔ لوگ ان سے دور ہٹنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ شراب افیون اور گانجا وغیرہ تمام حسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ اثر دیر تک قائم رہتا ہے مگر تمباکو سے ایسا نہیں ہوتا ۔ آپ کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو آپ کو نہیں کرنا چاہیئے تو آپ سگرٹ پی کر خود کو بقدر ضرورت مدہوش بنا لیتے ہیں ، اس کے بعد آپ پھر ہوش میں آجاتے ہیں اور اچھی طرح سوچنے لگتے ہیں ۔ یا فرض کر لیا جائے کہ آپ نے کوئی ایسا کام کیا ہے ، جو آپ کو نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔ تو آپ سگرٹ پیتے ہیں ۔ اور اس غلطی کے احساس کو مٹا کر کوئی اور کام کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ تمباکو نہ کسی مطلب کو پورا کرنے کے لئے اور نہ وقت کاٹنے کے لئے پیا جاتا ہے ۔ بلکہ صرف اپنا ضمیر کند بنانے کے لئے پیا جاتا ہے ۔ اور کیا ان تمام امور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کی زندگی اور اس کے دل میں تمباکو پینے کی خواہش

کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔

لڑکے کب تمباکو پینا شروع کرتے ہیں؟ ۔ عام طور پر اس وقت جب وہ اپنے بچپن کی معصومیت کھو دیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے جب انسان اپنی زندگی کے اخلاقی راستوں پر گامزن ہوتا ہے تو وہ تمباکو کی عادت ترک کر دیتا ہے اور جب ان راستوں سے ہٹ جاتا ہے تو پھر تمباکو پینا شروع کر دیتا ہے؟ ۔ کیا وجہ ہے کہ سب قمار باز تمباکو کے عادی ہوتے ہیں؟ ۔ وہ عورتیں جو ہموار زندگی بسر کرتی ہیں، کیوں بہت کم تمباکو پیتی ہیں؟ ۔ ولنیتا ہیں اور دیوانے سب کے سب تمباکو کے عادی کیوں ہوتے ہیں؟ ۔ عادت عادت ہے، لیکن تمباکو نوشی یقیناً ضمیر کو گُند بنانے والی خواہش سے متعلق ہے اور اس سے یہ خواہش پوری ہوتی ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے (میں خود بھی یہی کہا کرتا تھا) کہ تمباکو پینے سے دماغی کام اچھی طرح ہوتا ہے۔ اگر ہم دماغی کام کی مقدار کو پیش نظر رکھیں تو یہ بیان بلاشک شبہ صداقت پر مبنی ہے۔ وہ شخص جو تمباکو پیتا ہے اور جو انجام کار اپنے خیالات کو جانچنے اور پرکھنے کی قوت کھو دیتا ہے، عام طور پر یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے دماغ میں بے شمار خیالات آرہے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے دماغ میں واقعی بے شمار خیالات آرہے ہیں۔ دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہتا اور وہ غلط نتیجہ مرتب کر لیتا ہے۔

جب آدمی کام کرنے لگے تو اسے اپنے اندر دو وجودوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایک وہ وجود جو کام کرتا ہے اور دوسرا وہ جو جانچتا رہتا ہے۔ یہ جانچ جس قدر کڑی ہوگی، اسی قدر کام سست رفتاری سے مگر اچھا اور پختہ ہوگا۔ اور اگر یہ جانچ ٹڑتال

کمزور ہوگی تو کام جلدی مگر خام ہوگا۔ جب کام کرنے والے پر مدہوشی طاری ہوتی
ہے تو کام کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ مگر اس میں اچھائی پیدا نہیں ہوتی۔

لوگ عام طور پر کہتے ہیں "اگر میں تمباکو نہ پیوں تو لکھ ہی نہیں سکتا۔ شروع کرتا ہوں مگر لکھ ہی نہیں سکتے" میں بھی یہی کہا کرتا تھا۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ آپ لکھنا ہی نہیں چاہتے یا پھر یہ ہونا چاہیئے کہ آپ کے شعور میں لکھنے کی خواہش ابھی تک خام ہے، اس کی صرف دھندلی سی صورت آپ کی نظروں کے سامنے آرہی ہے جس کی خبر آپ کے اندر والا نقاد بشرطیکہ وہ مدہوش نہ ہو، آپ کو پہنچا دیتا ہے، اگر آپ تمباکو نہ پئیں تو آپ یقیناً یا تو لکھنے کا خیال ہی چھوڑ دیں گے یا پھر اس دھندلے خیال کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ پختگی اختیار کرے اور آپ کی نظروں کے سامنے صحیح شکل میں آجائے، لیکن اگر آپ نے تمباکو پی لیا اور آپ کے اندر والا نقاد مدہوش ہو جائے گا۔ اور وہ روک جو آپ کے راستے میں تھی ہٹ جائے گی۔ تمباکو پینے سے پہلے جو خیال آپ کو بالکل مبہم اور فضول نظر آتا تھا، تمباکو پینے کے بعد اہمیت اختیار کر لیتا ہے، وہ رکاوٹیں جو آپ کے راستے میں حائل تھیں، دور ہو جاتی ہیں۔ آپ لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ تیزی کے ساتھ . . . . . !

(۴)

لیکن کیا معمولی اور حقیر سا نشہ جو شراب اور تمباکو کے معتدل استعمال سے پیدا ہوتا ہے، اہم نتائج کا باعث ہوتا ہے؟ ۔ اگر کوئی شخص گانجا اور شراب پی کر گر پڑے اور اپنے حواس کھو دے تو یقیناً اہم نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر تمباکو اور گانجا وغیرہ

تھوڑی سی مقدار میں استعمال کیا جائے جو معمولی نشہ پیدا کرے، تو اس سے خطرناک نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ یہ بیان عام طور پر سننے میں آتا ہے اور فرض کر لیا گیا ہے کہ معمولی سی مدہوشی برا اثر پیدا نہیں کرتی، یہ تو ایسا ہی ہے، اگر یہ خیال کر لیا جائے کہ پتھر پہ گھڑی کو ٹپک دینے سے اس کو نقصان پہنچے گا، لیکن معمولی سا گرد و غبار اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ انسان کی زندگی کو وہ کام حرکت یا اکساہٹ نہیں بخشتا جو ہاتھوں پیروں یا پیٹھ سے کیا جائے بلکہ وہ کام حرکت بخشتا ہے جو ضمیر کرے۔ یا ہاتھوں اور پیروں سے اگر کوئی کام شروع کیا جائے تو شعوری احساس میں ردو بدل کا ہونا ضروری ہے اور یہی ردو بدل بعد کی حرکات کو واضح اور ممیز کرتا ہے، حالانکہ یہ بالکل معمولی اور ناقابلِ ادراک ہوتا ہے۔

بُرولوف (روس کا ایک مشہور و معروف مصوّر، ۱۸۵۲ء-۱۷۹۹ء) نے ایک روز اپنے شاگرد کی کھینچی ہوئی تصویر کی اصلاح کی۔ اصلاح شدہ تصویر کو دیکھ کر شاگرد ایکا ایکی بول اٹھا "آپ نے برش سے صرف چھوٹے چھوٹے نشان بنائے لیکن اس میں جان پیدا کر دی"۔ برولوف نے جواب دیا "آرٹ وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ چھوٹے چھوٹے نشان شروع ہوتے ہیں"۔

بُرولوف کا کہنا بالکل درست ہے۔ صرف آرٹ ہی کے بارے میں نہیں بلکہ تمام زندگی پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ صحیح زندگی کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے، جہاں سے ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ہونا ہے ـــ جہاں ہمارے قیاس کے مطابق ناقابلِ ادراک تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اصل زندگی وہاں

بسر نہیں کی جاتی جہاں بڑے بڑے خارجی انقلاب آتے ہیں، جہاں لوگ چلتے پھرتے ہیں، لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں بسر کی جاتی ہے جہاں بالکل ننھی ننھی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ننھی ننھی تبدیلیاں۔ لیکن ان ہی سے نہایت ہولناک اور نہایت اہم نتائج وابستہ ہوتے ہیں۔ کسی کام کا ارادہ کرنے سے لے کر اس کے کر گزرنے تک بہت سی مادی تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں، گھر کے گھر تباہ و برباد ہو سکتے ہیں، دھن دولت کا ستیاناس ہو سکتا ہے اور انسانوں کی غارت گری عمل میں آسکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم چیز وہ ہے جو انسان کے شعور میں چھپی ہوئی ہے۔ امکان یعنی ہو سکنے کی تحدید شعور ہی کرتا ہے۔

شعور کے اندر چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی ناقابل قیاس نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کا انسان کی اختیاری قوت یا عقیدۂ جبر یعنی جبریت سے کوئی تعلق ہے۔ اس پر بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ اس سوال کا فیصلہ کئے بغیر کہ آیا انسان اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے یا نہیں (یہ سوال میرے نزدیک درست نہیں ہے) میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب انسانی سرگرمیاں اور شعور کی خفیف ترین تبدیلیاں لازم و ملزوم ہیں تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے (ہم اختیاری قوت کی موجودگی کو تسلیم کریں یا نہ کریں) کہ ہم خاص طور پر ان حالات کا جائزہ کریں جن کے تحت یہ خفیف ترین تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی چیز تولتے وقت ہمیں ترازو کے پلڑوں کا خاص طور پر دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنے آپ کو اور دوسروں

کو ایسے حالات سے دور رکھیں جو خیال کی اس نزاکت اور صفائی پر اثر انداز ہوتے ہوں۔ جن کے بغیر شعور اپنا کام صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں منشیات کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ ضمیر و شعور کے کام میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔

چونکہ انسان بیک وقت روحانی اور حیوانی مخلوق ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی ان اشیاء سے متاثر ہو جائے جو اس کی روحانی فطرت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کبھی ان اشیاء سے متاثر ہو جائے جو اس کی حیوانی فطرت پر اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ کلاک سوئیوں کے ذریعے سے بھی متحرک ہو سکتا ہے اور بڑے پہیے کے ذریعہ سے بھی حرکت میں آ سکتا ہے۔ جس طرح بہتر صورت یہ ہے کہ کلاک کو اس کی اندرونی مشینری کے ذریعے سے منضبط کیا جائے ٹھیک اسی طرح انسان خود کو ضمیر یا شعور ہی کے ذریعے سے باضابطہ بنا سکتا ہے۔

(۵)

لوگ وقتی طور پر اداسی دور کرنے کے لئے یا فرحت حاصل کرنے کے لئے شراب نہیں پیتے اور نہ وہ اس لئے پیتے ہیں کہ یہ خوش گوار شے ہے بلکہ اپنے اندر اپنے ضمیر کی آواز غرق کرنے کے لئے پیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہت ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہوں گے۔ ذرا اسی عمارت کے نقشے کا تصور کیجئے جس کی دیواریں اور کونے ضروری آلات کی مدد کے بغیر تیار کئے گئے ہوں گے۔ کیا ایسی عمارت پائیدار ہو سکتی ہے؟

لیکن لوگ پھر بھی اپنے آپ کو مدہوش کرتے ہیں۔ جب زندگی ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی تو ضمیر کو توڑ مروڑ کر اس کے ساتھ منضبط کر دیا جاتا ہے۔

ضمیر کو مدہوش بنانے کی صحیح اہمیت معلوم کرنے کے لئے آپ اپنی زندگی کے ہر

دور کے روحانی لمحات کو پیشِ نظر رکھئے۔ آپ کو یاد آجائے گا کہ ہر دور میں آپکے سامنے کوئی نہ کوئی اخلاقی سوال تھا، جس کو آپ حل کرنا چاہتے تھے اور جس کے حل ہونے سے آپ کی زندگی کی بہتری وابستہ تھی۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے توجہ کے اجتماع و انہماک کی ضرورت تھی، ہر محنت و مشقت سے متعلقہ کام کرنے میں اور خاص طور پر اس کے شروع کرتے وقت ایسے لمحات آتے ہیں، جب یہ مشکل اور تکلیف دہ معلوم ہوا کرتا ہے اور جب انسانی کمزوری یہ خواہش پیدا کیا کرتی ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ جسمانی کام تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور دماغی کام اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے۔ جیساکہ لیننگ کہتا ہے لوگ عام طور پر اس وقت سوچنا بند کر دینا چاہتے ہیں، جب کوئی خیال مشکل محسوس ہوتا ہے، لیکن میں کہوں گا کہ یہیں جہاں سے یہ مشکل شروع ہوتی ہے، سوچنا یعنی غور و فکر بارآور ہونا شروع ہوتا ہے۔

جب آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر سوالات کے تصفیے پر محنت صرف ہوگی جو عام طور پر تکلیف دہ ہوتی ہے تو اس کے دل میں اس الجھن سے نجات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کے پاس خود کو مدہوش بنانے والے ذرائع نہ ہوتے تو وہ اپنے ضمیر سے ان سوالات کو کبھی خارج نہ کر سکتا۔ جو اس کے درپیش تھے، لیکن چونکہ اس کو ایسے ذرائع معلوم نہیں جن سے ان خیالات کو بھگایا جاسکتا ہے، اس لئے وہ بوقت ضرورت انہیں استعمال کرتا ہے۔

جونہی حل طلب سوالات اس کو دق کرنا شروع کرتے ہیں، دکھ دینے لگتے ہیں۔ وہ جھٹ سے ان ذرائع کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان تکلیف دہ سوالوں کی پیدا کردہ پریشانی سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضمیر ان

سوالوں کا حل طلب کرنا بند کر دیتا ہے اور یہ غیر حل شدہ سوال آئندہ روحانی لمحات تک غیر حل شدہ رہتے ہیں اور جب یہ لمحات آتے ہیں تو پھر وہ انہی ذرائع کو استعمال کرتا ہے اور انجام کار وہ اپنی زندگی اسی طرح گزار دیتا ہے اور اخلاقی سوالات جو اس کے درپیش تھے، ویسے کے ویسے حل طلب رہتے ہیں۔ حالانکہ ان سوالات کے حل ہونے ہی میں زندگی کی ساری حرکت پوشیدہ ہے۔

ایسے لوگوں کی مثال بالکل اس انسان کے مانند ہے، جو گدلے پانی کے پاس کھڑا ہو اور اس کے اندر داخل ہو کر موتی نکالنے سے گھبراتا ہو۔ چنانچہ بار بار جب کہ پانی پُرسکون اور شفاف ہونے لگے تو وہ اسے ہلا کر پھر گدلا بنا دے۔

اگر آپ اس زمانے کو پیش نظر رکھیں جب آپ تمبا کو اور شراب پیا کرتے تھے یا دوسرے پینے والوں کے متعلق اپنے تجربے پر نظر کریں تو آپ کو منشیات کے عادی لوگوں اور منشیات سے پرہیز کرنے والوں کے درمیان ایک مستقل منقسم لکیر نظر آئے گی لوگ جس قدر زیادہ منشیات کو استعمال کریں گے، اسی قدر وہ اخلاقی طور پر غیر حساس ہوتے چلے جائیں گے۔

(۶)

جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے افیم اور گانجے کے نتائج بڑے ہولناک ہوتے ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں پکے شرابیوں کے لئے شراب نہایت مہلک نتائج کا موجب ہوتی ہے اور اس سے زیادہ شراب، بیئر، تمبا کو وغیرہ کا معتدل استعمال جو بالکل بے ضرر سمجھا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی کے لئے ہولناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔

نتائج فطری طور پر ہولناک اور خطرناک ہونے چاہئیں، اس حقیقت کے

پیش نظر کہ سوسائٹی کی معاشری، افری، سائنٹیفک ادبی اور فنی سرگرمیاں زیادہ تر ان لوگوں سے متعلق ہیں۔ جو غیر معتدل ہوتے ہیں یعنی جو شراب پیتے ہیں۔

عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کھانا کھانے کے بعد شراب پیتے ہیں دوسرے روز کام کے اوقات میں بالکل ٹھیک اور معتدل حالت میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ وہ لوگ جو شراب بیئر یا کسی اور نشیلی چیز کے ایک دو گلاس پیتے ہیں، دوسرے دن اُن پر غنودگی کی حالت طاری ہوتی ہے اور وہ خود کو اداس اداس محسوس کرتے ہیں جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ان کی دماغی پژمردگی اور ناتوانی کو تمباکو نوشی اور بھی زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ تمباکو اور شراب کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے والے اگر اپنے دماغ کو اصلی حالت میں لانا چاہیں تو کم از کم ایک ہفتہ درکار ہو گا مگر ایسا شاذ و نادر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوتا ہے (خواہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں کے سر پر ہو، جو حکومت کرتے ہیں یا دوسروں کو سبق دیتے ہیں۔ خواہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں سے متعلق ہو، جو محکوم ہیں اور دوسروں سے سبق لیتے ہیں) سنجیدہ و متین حالت میں نہیں ہوتا۔

اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگیوں کے انتشار اور ان کے متعفن کا باعث مدہوشی کی وہ مستقل حالت ہے، جس میں کہ اکثر لوگ رہتے ہیں تو آپ اُسے مذاق نہ سمجھیے گا۔ اگر لوگ مدہوشی کی حالت میں نہ ہوں تو ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے کیا کسی کے وہم و گمان میں آسکتا ہے۔ ایفل ٹاور بنانے سے لے کر فوجی ملازمت اختیار کرنے تک!

کسی ضرورت کے بغیر ایک کمپنی بنائی جاتی ہے، سرمایہ اکٹھا کیا جاتا ہے، لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں، حساب لگاتے ہیں، اسکیمیں تیار کرتے ہیں لاکھوں ٹن لوہا ایک منار بنانے پر صرف کر دیا جاتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ کروڑوں آدمی اس منار پر چڑھنے کو اپنا فرض یقین کرتے ہیں۔ اس منار کی تعمیر دوسرے لوگوں کے دلوں میں اس سے بڑے منار بنانے کی خواہش پیدا کرتی ہے، ذرا غور فرمائیے کیا صحیح دماغی حالت میں ایسی فضول باتیں سوجھ سکتی ہیں؟

ایک اور مثال لیجئے۔ یورپی اقوام کئی برسوں سے ایسے عمدہ طریقے ایجاد کرنے پر غور و فکر کر رہی ہیں جن سے انسانوں کو ہلاک کیا جا سکے اور لاکھوں نوجوانوں کو بالغ ہونے کے ساتھ ہی قتل و غارت کے طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اب بربری لوگوں کے حملوں کا کوئی خطرہ نہیں رہا، لیکن یہ جنگی تیاریاں متمدن و مہذب اقوام عمل میں لاتی ہیں۔ جو عیسائی مذہب رکھتی ہیں۔ اور پھر وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتی ہیں — سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ تکلیف دہ، ضرر رساں، سکون شکن، تباہ کن اور اخلاق و ادراک کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے باوجود سب باہمی قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

بعض سیاسی تدبیریں سوچتے ہیں کہ کیسے۔ کس کس کے ساتھ مل کر اور کس کو تباہ و برباد کرنا چاہیئے، بعض ان لوگوں کی تنظیم کرتے ہیں۔ جن کو قتل و غارتگری کے سبق دیئے جا رہے ہوتے ہیں، بعض اپنے ضمیر اپنے ادراک اور اپنی مرضی کے خلاف قتل و غارت کی ان تیاریوں کے سامنے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ کیا متین و سنجیدہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں؟ — صرف شرابی ہی ایسے کام کر سکتے ہیں جو سنجیدگی و متانت

کی صحیح حالت تک کبھی نہیں پہنچتے۔

میرا خیال ہے کہ آج سے پہلے لوگ کبھی ایسی زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ جس میں ضمیر اور افعال کے درمیان اس قدر فاصلہ ہو کہ انسانیت ایک جگہ کر رُک گئی ہے، رُک گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی خارجی سبب نے اسے فطری حالت اختیار کرنے سے روک رکھا ہے جو اسے من حیث العلت اختیار کرنا چاہیئے تھی۔ اور یہ سبب ...... اگرچہ یہ اکیلا ہی نہ ہو یقیناً جسمانی طور پر خود کو مدہوش کرنا ہے اور یہ سب سے بڑا سبب ہے جس کے ذریعے سے لوگ اپنے آپ کو دن بدن کمزور اور ضعیف بنا رہے ہیں۔

انسانیت کی تاریخ میں وہ دن قابلِ یادگار ہوگا۔ جب اس خطرناک برائی سے نجات حاصل کی جائے گی۔ اور وہ دن دُور نہیں اس لئے کہ اس برائی کے نتائج سے لوگ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔ مدہوش بنانے والی اشیاء کے متعلق لوگوں کا نظریہ بہت حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور ان اشیاء کے خطرناک نقصانات سے لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ اب وہ دن بہت نزدیک ہے۔ جب یہ بیداری لوگوں کو ان مدہوش بنانے والی چیزوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دے گی۔ اور ان کی آنکھیں کھول دے گی تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطالبات دیکھ سکیں اور ان پر غور کر سکیں۔

کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمیندار

ہمارے دو سال کے تجربات نے جو ہمیں قحط زدہ علاقہ میں امدادی رقوم تقسیم کرنے کے دوران میں حاصل ہوئے ہیں، ہمارے ان دیرینہ افکار و آرا کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ مصائب جن کی روک تھام کے لئے ہم روس کے ایک کونے میں بیٹھ کر بیرونی ذرائع سے سعی کر رہے ہیں۔ کسی غیر مستقل وجہ کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان مستقل و غیر مختتم اسباب و علل کا نتیجہ ہیں جو ہم تعلیم یافتہ لوگوں کے اس غیر ہمدردانہ سنگ دلانہ سلوک کے پیدا کردہ ہیں جو غریب مزدوروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔

غربا اپنی محنت و مشقت اور لامتناہی مصائب سہنے کے علی الرغم ہمارے محتاج ہیں۔ اور ہم اس آقائی اور مولائی حیثیت کے باوجود ان سے بے پروا ہیں۔
اگر اس سال اس احتیاج، ستم زمستاں اور بھوک (جس کے شکار لاکھوں مظلوم نوجوان اور ہزاروں سسکتے ہوئے بوڑھے اور بیسیوں بلکتے ہوئے بچے ہوتے ہیں) کی ستم افرینیوں سے ہمارے کان نا آشنا ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ

بلائیں پھر نازل نہ ہوں گی ــــ وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہیں گی اور ہم انہیں فراموش کر دیں گے۔ ہم اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ ان کا وجود باقی نہیں رہا۔ اور یہ کہ اگر نام و نشان باقی ہے تو یہ قانونِ قدرت ہے ہمیں اس میں کیا دخل!

یہ یقین و تیقن دروغ بافی پر مبنی ہے۔ نہ صرف ان آفات سے بچاؤ ممکن ہے بلکہ ان کا استیصال ضروری ہے۔ وقت آرہا ہے کہ وہ نابود ہو کر رہیں گی اور وہ وقت اب قریب تر ہے۔

ہمیں مزدور جماعتوں سے اپنا شراب سے لبریز پیالہ پوشیدہ معلوم ہوتا ہے ہم جدی رسوم اور چالاک دلائل ہی سے عیش پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی ان مزدوروں کے درمیان گزارتے ہیں جو محنت و مشقت کی تکالیف اٹھا کر اپنے گاڑھے پسینہ سے ہمارے لئے یہ سامانِ عیش مہیا کرتے ہیں۔

مگر اب مشعلِ علم ہمارے رستوں کو منور بنا رہی ہے اور ہم بہت جلد ایک خطرناک مجرم کی حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش ہوں گے ــــ ایک ایسا مجرم جو یکایک طلوعِ آفتاب کی وجہ سے کسی جرم کا ارتکاب کرتا پکڑا جائے۔

اگر ایک دکان دار ضرر رساں اور خراب اشیاء مزدوروں کے پاس فروخت کرتا ہے یا روٹی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کو جنہیں وہ کوڑیوں کے مول خریدے اور دمڑیوں کے دام بیچ کر یہ دعوے کرے کہ وہ ایمان داری سے لوگوں کی ضروریات مہیا کرتا ہے۔ اگر سگرٹ شراب اور آئینے بنانے والا کارخانہ یہ بلند بانگ دعاوی کرے کہ وہ مزدوروں کے لئے کام مہیا کر کے ان کا روزی رساں بنا ہے۔ اگر کوئی

افسر جو سالانہ ہزاروں پونڈ مشاہرہ حاصل کرتا ہے یہ یقین دلائے کہ وہ قوم کی خدمت کر رہا ہے اور اگر زمیندار یہ لاف زنی کرے کہ وہ زراعت کے بہترین اصولوں سے اپنے گاؤں میں خوشحالی پھیلا رہا ہے ——— اگر یہ تمام چیزیں آج ممکن ہیں۔ یہ دعاوی آج بیانگِ دُہل دہرائے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ہزاروں غریب کسان بھوکے مر رہے ہیں اور زمیندار کئی ایکڑ زمین میں آلو کی صرف اس غرض سے کاشت کر رہا ہے۔ کہ ان سے شراب کشید کی جا سکے تو کل یہ حالات نہ رہیں گے اور بہ دروغ دعاوی فضا کو متعفن نہ کریں گے۔

محولہ فوق وجوہ کی بنا پر ہم یہ خیال کرنے سے عاری ہو گئے ہیں کہ ان ہزاروں گرسنہ شکم لوگوں کو جو ہمارے گرد کام کی زیادتی اور مشاہرے کی کمی کی وجہ سے تڑپ رہے ہیں۔ ہماری ضروریات ہم پہنچانے کے لئے نانِ خشک تک نصیب نہیں ہوتی۔

باغوں کی رنگ رلیاں، شکارگاہوں کی ہنگامہ آرائیاں، شراب نوشی کی مجلسیں۔ پنیر اور گوشت کے ٹکڑے تک وہ ہمارے لئے جانفشانی سے مہیا کرتے ہیں اور ہمارے عیش کی افراط ان پر کام کا اور بھاری بوجھ ڈال دیتی ہے۔

ہم روسی لوگ اپنی حقیقت اور حالت کو سمجھنے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ مجھے اس نوجوان کا واقعہ بخوبی یاد ہے۔ جو مجھ سے گزشتہ موسم سرما میں ملنے آیا تھا۔ ہمیں ایک کسان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا اس گھر میں ہر طرف میلی کچیلی چیزیں بکھری ہوئی تھیں، چیتھڑے لٹکائے ہوئی زرد عورتیں اور بیمار بچہ جو بلک رہا تھا فضا متعفن اور کثیف تھی، ہر طرف اداسی اور حسرت برس رہی تھی۔ مقیموں کے

زرد چہرے رحم کے متمنی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم جھونپڑی سے باہر نکلے تو اس نوجوان نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ ماسکو اور پیٹرزبرگ میں چند مہینے گزار کر آیا تھا۔ اس نے وہاں کے حسین باغوں کی سیر کی تھی، شاندار محلات دیکھے تھے۔ جہاں ہر وقت مسرتیں کھیلتی ہیں اور ہر تعیش پسند جماعت میں شمولیت کی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اس نے ان لوگوں کا نقشہ دیکھا جو اپنے گاڑھے پسینہ سے سامانِ عیش مہیا کرتے ہیں۔ وہ حیرت زدہ و ہراساں ہو گیا۔

شاید اسے بوہیمیا میں جو اس کا وطن ہے، جہاں دولت و ثروت کا کوئی شمار نہیں اور جہاں تعلیم عام ہونے کے وجہ سے ہر ایک مجلسی دائرے میں شمولیت حاصل کر سکتا ہے۔ مشقت کا ثمرہ معلوم ہو مگر وہ ان ہزاروں لوگوں سے قطع نظر کر کے یہ نظریہ قائم کرتا ہے جو رات کوئلے کی کانوں میں مشقتیں اٹھاتے ہیں اور یہ سامانِ عیش مہیا کرتے ہیں۔

شاید وہ ان لوگوں کو بھی بھول جائے جو ہماری ضروریات کو مہیا کرنے کے لئے اپنی جانیں قربان کرتے ہیں۔ لیکن ہم روسی لوگ ایسے خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتے۔ عیش اور مشقت کا رشتہ بیاں عیاں تر ہے اور ایک قوم کے افراد کی تعیش پرستیاں اور ناداریاں ہم پر روشن ہیں ___ ہم اس قیمت سے جو ہمارے عیش و آرام کی خاطر دوسرے انسانوں کو ادا کرنی پڑتی ہے، منہ نہیں پھیر سکتے۔

ہمارے لئے سورج طلوع ہو چکا ہے اور ہم حقیقت سے اغماض نہیں کر

سکتے ہم حکومت کی آڑ لے کر لوگوں پر حکومت کرنے کی ضرورت کا عذر پیش نہیں کر سکتے۔ سائنس اور آرٹ کے پردے میں چھپ کر جو کہ موجودہ زمانے میں لازمی تصور کئے جاتے ہیں، اپنی ملکیت کے بل بوتے پر یا جدّی رسوم کی تقلید کی وجہ بیان کر کے ان کمزوریوں کو نہیں چھپا سکتے اور نہ برقرار رکھ سکتے ہیں۔

آفتاب حقیقت کی کرنیں ان تمام پردوں کو چاک کر دیں گی — اب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ جو لوگ حکومت کی خدمت کرتے ہیں وہ لوگوں کے فلاح کے لئے نہیں بلکہ روپیہ بٹورنے کی خاطر ہے۔ وہ لوگ جو زمین کے مالک ہیں اور وہ اپنی زمین پر کاشت کی قیمت بڑھا کر مقدس حقوق کے لئے کوشاں نہیں بلکہ اپنی عیش پرستیوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے آمدنی کے خواہاں ہیں — اب یہ باتیں چھپ نہیں سکتیں! یہ زروغ تلکے؟

اب اہلِ ثروت کے لئے دو راستے کشادہ ہیں — ان کے لئے جو کچھ کام نہیں کرتے مگر سنہری اشرفیوں کے مالک ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ وہ مذہب بلکہ انسانیت انصاف اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف سے منہ موڑ کر انہیں یہ کہہ کر جھٹکا دیں۔

میں ان حقوق و فوائد کا واحد مالک ہوں اور خواہ کچھ بھی ہو انہیں کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ علیحدہ کرنا چاہے تو اسے پہلے میری طاقت کو زیرِ غور لانا چاہیئے — میرے ہاتھ میں طاقت ہے، میں سپاہی مہیا کر سکتا ہوں قید کروا سکتا ہوں، دُرّے لگا سکتا ہوں اور تو اور پھانسی پر لٹکوا سکتا ہوں۔

دوسرا راستہ اپنے قصوروں کا اعتراف، جھوٹ سے کنارہ کشی، عفو خواہی اور عوام کی امداد کے لئے سعی ہے، صرف زبانی نہیں، جیسا کہ ان دو سالوں میں

کی گئی ہے بلکہ اس پیسے سے جوان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہے۔ مگر ان سے زبردستی چھین لی گئی ہے اور ان دیواروں کو جو ہمارے اور مزدوروں کے درمیان ایستادہ ہیں مسمار کرنا ہے۔ لفظوں سے نہیں بلکہ اعمال سے، انہیں اپنا بھائی سمجھ کر، اپنی زندگی کے موجودہ طریقوں کو بدل کر، اپنے ذاتی حقوق اور فوائد چھوڑ کر اور مزدوروں کے ساتھ کام کر کے سائنس اور ادب کی برکات سے متمتع ہونا ہے ــــ وہ برکات جو ہم بغیر ان کی رضا کے ان پر دھکیل رہے ہیں۔

ہم دو راستوں کے چوک پر کھڑے ہیں۔ اور ہمیں ایک راستہ انتخاب کرنا ہے۔ ایک راستہ انسان کو دائمی برائیوں اور لعنتوں میں مبتلا کرنے کے لئے اس میں بدکرداروں کے آشکارا ہونے کا ڈر اور موجودہ نظام کے بدل جانے کا احتمال قدم قدم پر نظر آتا ہے۔

دوسرا راستہ سچے دل سے حقیقی اصولوں کو مان لینے اور ان کی ترویج کے لئے بے لوث کوشش کرنے کے لئے کھلا ہے ــــ وہ اصول جن کی ترویج کے لئے انسانی عقل و ادراک پکار رہی ہے اور آج بالکل ضرور منوا لئے جانے والے ہیں ــــ اگر ہم نہیں تو ہمارے بعد کے آنے والی نسلیں انہیں منوا کر رہیں گی۔ اس لئے کہ اس انانیت کا استیصال ہی ان تمام بلاؤں اور آفتوں سے ملک اور قوم کو بچا سکتا ہے۔

دروغ بافیوں سے احتراز، تعیش پرستیوں سے پرہیز اور برادرانہ اخوت ان تمام بیماریوں کی تیر بہدف دوا ہے۔

ترقی یافتہ قبرستان

انگریزی تہذیب و تمدن کی خوبیاں کہاں تک گنوائی جائیں۔ اس نے ہم غیر تہذیب یافتہ ہندوستانیوں کو کیا کچھ عطا نہیں کیا۔ ہماری کنواری عورتوں کو اپنے نسوانی خطوط کی نمائش کے نت نئے طریقے بتائے۔ جسمانی خوبیوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے بغیر آستینوں کے بلاؤز پہننے سکھائے۔ مسی کاجل نہیں رہا۔ سنگھار دانوں میں لپ اسٹک، روج، پاؤڈر اور افزائش حسن کی اور چیزیں سجا دیں۔ پہلے ہمارے یہاں موچنے صرف ناک یا مونچھوں کے بال چننے کے کام آتے تھے، مگر تہذیب فرنگ نے ہماری عورتوں کو ان سے اپنی بھنووں کے بال چننا سکھایا۔

یہ تہذیب ہی کی برکت ہے کہ اب جو عورت چاہے لائسنس لے کر کھلے بندوں اپنے جسم کی تجارت کر سکتی ہے، ترقی یافتہ مردوں اور عورتوں کے لئے سول میرج کا قانون موجود ہے، جب چاہیئے شادی کر لیجئے اور جب چاہیئے طلاق حاصل کر لیجئے۔ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آتا ہے۔ ناچ گھر موجود ہیں، جہاں آپ عورتوں کے ساتھ سینے سے سینہ ملا کر کئی قسم کے ناچوں میں شریک ہو

سکتے ہیں، کلب گھر موجود ہیں، جہاں آپ بڑے مہذب طریقے سے اپنی ساری دولت جوئے میں ہار سکتے ہیں۔ مجال ہے کہ آپ کبھی قانونی گرفت میں آئیں۔ شراب خانے موجود ہیں جہاں آپ غم غلط کر سکتے ہیں۔

انگریزی تہذیب و تمدن نے ہمارے وطن کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے اب ہماری عورتیں پتلونیں پہن کر بازاروں میں چلتی پھرتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں، جو قریب قریب کچھ بھی نہیں پہنتیں لیکن پھر بھی آزادانہ گھوم پھر سکتی ہیں — ہمارا ملک بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے، کیونکہ اب یہاں "ننگا کلب" کھولنے کی بھی تجویز ہو رہی ہے۔

وہ لوگ سرپھرے ہیں جو اپنے محسن انگریزوں سے کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں، اگر یہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو ہمارے یہاں "ننگا کلب" کون جاری کرے گا۔ یہ جو رقص خانے ہیں، ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ہم عورتوں کے ساتھ سینے سے سینہ ملا کر کیسے ناچ سکیں گے۔ ہمارے چکلے کیا ویران نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے سے لڑنا کون سکھائے گا۔ مانچسٹر سے جو کپڑے اب ہماری کپاس سے تیار ہو کر آتے ہیں پھر کون تیار کرے گا۔ یہ اچھے اچھے لذیذ بسکٹ جو ہم کھاتے ہیں ہمیں کون دے گا۔

جو ترقیاں اور ہمارے ہندوستان کو انگریزوں کے عہد میں نصیب ہوئی ہے اور کسی کے عہد میں نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم آزاد بھی ہو جائیں تو ہمیں حکومت کرنے کی وہ چالیں نہیں آسکتیں جو ہمارے ان حاکموں کو آتی ہیں۔ ان حاکموں کی جن کے عہد میں نہ صرف ہمارے ہوٹلوں، کلبوں، رقص خانوں اور

سنیماؤں کو بلکہ ہمارے قبرستانوں کو بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔

غیر ترقی یافتہ قبرستانوں میں مردے اٹھا کر گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ جیسے وہ کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رکھتے، لیکن ترقی یافتہ قبرستانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے اس ترقی کا احساس اس وقت ہوا جب بمبئی میں میری والدہ کا انتقال ہوا۔ میں چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مہذب شہروں میں رہنے کا عادی تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ بڑے شہروں میں مردوں پر بھی حکومت کی طرف سے پابندیاں عائد ہیں۔

والدہ کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی تھی۔ میں غم کا مارا سر نیوڑھائے ایک صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب نے جو عرصے سے بمبئی میں رہتے تھے مجھ سے کہا "بھئی اب تم لوگوں کو کچھ کفن دفن کی فکر کرنی چاہیئے۔"

میں نے کہا "سو یہ آپ ہی کریں گے، کیونکہ میں یہاں نووارد ہوں۔"

انہوں نے جواب دیا "میں سب کچھ کر دوں گا مگر پہلے تمہیں کسی کے ہاتھ اطلاع بھجوا دینی چاہیئے کہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"کس کو؟"

"یہاں پاس ہی میونسپلٹی کا دفتر ہے اس کو اطلاع دینی بہت ضروری ہے کیونکہ جب تک وہاں سے سرٹیفکیٹ نہیں ملے گا قبرستان میں دفنانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

اس دفتر کو اطلاع بھیج دی گئی۔ وہاں سے ایک آدمی آیا جس نے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کئے۔ "کیا بیماری تھی، کتنے عرصے سے مرحومہ بیمار تھی۔ کس ڈاکٹر کا علاج ہو رہا تھا؟"

حقیقت یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے میری والدہ کا انتقال ہوا تھا، ظاہر ہے کہ وہ کسی کی زیرِ علاج نہیں تھیں اور نہ مدت سے بیمار ہی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس آدمی سے جو سچی بات تھی کہہ دی، اس کا اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگا "آپ کو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دکھانا پڑے گا کہ موت واقعی ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

میں سٹپٹا گیا کہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کہاں سے حاصل کروں، چنانچہ کچھ سخت کلمے میرے منہ سے نکل گئے، لیکن میرے وہ دوست جو ایک عرصے سے بمبئی میں قیام پذیر تھے اٹھے اور اس آدمی کو ایک طرف لے گئے، کچھ دیر اس سے باتیں کرتے رہے، پھر آئے اور میری طرف اشارہ کرکے کہنے لگے "یہ تو بالکل بیوقوف ہے، اس کو یہاں کی باتوں کا کچھ علم نہیں" پھر انہوں نے میری جیب سے دو روپے نکال کر اس آدمی کو دیئے جو ایک دم ٹھیک ہو گیا اور کہنے لگا "اب آپ ایسا کیجئے کہ دواؤں کی چند خالی بوتلیں مجھے دے دیجئے تاکہ بیماری کا کچھ تو ثبوت ہو جائے پرانے نسخے وغیرہ پڑے ہوں تو وہ بھی مجھے دے دیجئے۔"

اس نے اس قسم کی اور باتیں کیں جن کو سن کر مجھے تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنی والدہ کا قاتل ہوں اور یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے مجھ پر ترس کھا کر اس راز کو اپنے تک ہی رکھنا چاہتا ہے اور مجھے ایسی ترکیبیں بتا رہا ہے جس سے قتل کے نشانات مٹ جائیں۔ اس وقت جی میں آئی تھی کہ دھکے دے کر اس کو باہر نکال دوں، اور گھر میں جتنی خالی بوتلیں پڑی ہیں، ان سب کو ایک ایک کرکے اس کے بے مغز سر پہ پھوڑتا چلا جاؤں، لیکن اس تہذیب و تمدن کا

بھلا ہو کہ میں خاموش رہا اور اندر سے کچھ نوٹ نکلوا کر اس کے حوالے کر دیں۔

دو روپے رشوت کے طور پر ادا کرنے کے بعد میونسپلٹی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا گیا تھا۔ اب قبرستان کا دروازہ ہم پر کھلا تھا۔ لوہے کے بہت بڑے دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جیسا کہ سنیما کے ساتھ بکنگ آفس ہوتا ہے، اس کی کھڑکی میں سے ایک آدمی نے جھانک کر اندر جاتے ہوئے جنازے کو دیکھا اور کچھ کہنے ہی کو تھا کہ میرے دوست نے وہ پرچی جو میونسپلٹی کے دفتر سے ملی تھی۔ اس کے حوالے کر دی۔ قبرستان کے مینجر کو اطمینان ہو گیا کہ جنازہ بغیر ٹکٹ کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بڑا خوبصورت قبرستان تھا۔ ایک جگہ درختوں کا جھنڈ تھا جس کے سائے تلے کئی پختہ قبریں لیٹی ہوئی تھیں۔ ان قبروں کے آس پاس موتیا، چنبیلی اور گلاب کی جھاڑیاں اُگ رہی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ قبرستان کا سب سے اونچا درجہ ہے جہاں ہائی کلاس آدمی اپنے عزیزوں کو دفن کرتے ہیں۔ ایک قبر کے دام مبلغ تین سو روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ رقم دینے کے بعد قبرستان کی اس ٹھنڈی اور ہوادار جگہ میں آپ اپنی یا اپنے کسی عزیز کی پختہ قبر بنا سکتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کرنا ہو تو آپ کو چھ روپے سالانہ اور دینا پڑیں گے، یہ رقم لے کر مینجر صاحب اس بات کا خیال رکھیں گے کہ قبر ٹھیک حالت میں رہے۔

وہ لوگ جو تین سو روپیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ان کی قبریں تین یا چار سال کے بعد کھود کھاد کر مٹا دی جاتی ہیں، اور ان کی جگہ دوسرے مردے گاڑ دیئے جاتے ہیں۔ ان قبروں کو درختوں کی چھاؤں اور موتیا، چنبیلی کی خوشبو

نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں دفناتے وقت مٹی کے ساتھ ایک خاص قسم کا مصالحہ ملا دیا جاتا ہے تاکہ لاش اور اس کی ہڈیاں جلدی گل سڑ جائیں۔

چونکہ ایک ہی شکل صورت کی قبریں قطار اندر قطار چلی گئی ہیں۔ اس لئے ہر قبر پہ نمبر لگا دیا گیا ہے تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو۔ یہ نمبر چار آنے میں ملتا ہے۔ آج کل اچھے سینماؤں میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ نمبر لگے ٹکٹ دیئے جاتے ہیں تاکہ ہال میں گڑبڑ نہ ہو اور آدمی اس نمبر کی سیٹ پر بیٹھے جس نمبر کا اس کے پاس ٹکٹ ہے۔ جب مردہ دفن کر دیا جاتا ہے تو قبرستان کا مہتمم ایک خاص نمبر جو لوہے کی تختی پر لکھا ہوتا ہے، قبر کے پہلو میں گاڑ دیتا ہے، یہ اس وقت تک گڑا رہتا ہے جب تک قبر کسی دوسرے مردے کے لئے خالی نہیں کی جاتی۔

نمبر ملنے سے کتنی آسانی ہو جاتی ہے، یعنی آپ اپنی نوٹ بک میں اپنے عزیزوں کی قبروں کا نمبر بھی درج کر سکتے ہیں۔

جوتے کا نمبر :-	پانچ
جراب کا نمبر :-	ساڑھے نو
ٹیلی فون کا نمبر :-	۴۴۴۵۷
بیمہ کی پالیسی کا نمبر :-	۲۲۵۶۸۹
والدہ کی قبر کا نمبر :-	۴۸۱۷

اور اگر زمانہ زیادہ ترقی کر گیا تو پیدا ہوتے ہی آپ کو اپنی قبر کا نمبر مل جایا کرے گا۔

قبرستان میں داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت مسجد دکھائی دی جس کے باہر

ایک بہت بڑے بورڈ پر "ضروری اطلاع" کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"اگر کوئی شخص اپنے وارث کا کچا اوٹا بنانا چاہے تو وہ گورکھودو بنا دیں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ بڑی قبر بنانے کے دو روپیہ چار آنے۔ جس میں سوا روپیہ گورکھودو کی مزدوری اور ایک روپیہ قبرستان کا حق، چھوٹی قبر کا سوا روپیہ جس میں گورکھودو کی مزدوری بارہ آنے اور قبرستان کا حق آٹھ آنے۔ اگر نہ دیں گے تو ان کا اوٹا نکال دیا جائے گا، قبرستان میں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں۔ ہاں میت کے ساتھ آویں اور اپنا توشہ لے کر باہر چلے جاویں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، اگر کوئی میت باہر سے بغیر غسل کے آوے اور اس کے ساتھ غسل دینے والا بھی ہو تو اس سے قبرستان کا حق چار آنے لیا جائے گا۔ جس میت کو غسل رات کو دیا جائے گا اس سے دو آنہ روشنی کا لیا جائے گا۔ کوئی شخص قبرستان میں دنگا فساد نہ کرے اگر کرے گا تو اس کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ قبر کے وارث اپنے اوٹے پر پانی ڈالنے اور درخت لگانے کا کام گورکھودوں کے سپرد کر دیں تو ان کو چار آنہ ماہوار دینا ہوگا۔ جو صاحب نہ دیں گے ان کی قبر پر گورکھودو نہ پانی ڈالیں گے اور نہ درخت اگائیں گے۔"

مینجنگ ٹرسٹی

سینماؤں کے اشتہار اور قبرستان کے اس اعلان میں ایک گونہ مماثلت ہے۔ کیونکہ وہاں بھی لکھا ہوتا ہے۔ "شراب پی کر آنے والوں اور دنگا فساد کرنے والوں کو حوالہ پولیس کر دیا جائے گا۔" بہت ممکن ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ اس اعلان میں ترمیمیں ہوتی جائیں۔ اور کبھی ایسے الفاظ کا بھی اضافہ ہو جائے۔

بھونچال آنے یا بمباری کی صورت میں منتظم قبروں کے دام واپس نہیں کرے گا۔

جو صاحب اپنے عزیز واقارب کی قبر پر ایئر ریڈ شیلٹر بنوانا چاہیں، انہیں ڈھائی سو روپیہ زائد ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس صورت میں بھی قبر کی حفاظت کی ذمہ داری منتظم پر عائد نہ ہوگی۔ قبر کو ایئر کنڈیشنڈ بنانے کے لئے چھوٹے چھوٹے پلانٹ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہر ماہ جتنی بجلی خرچ ہوگی اس کا بل قبر کے وارث کو ادا کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔

ایک بورڈ اور دکھائی دیا جس پر غسل وغیرہ کے نرخ مندرج تھے۔ ملاحظہ ہو۔

نماز جنازہ اور تلقین پڑھائی	۶/
غسل بڑی میت	ایک روپیہ ۴/
غسل چھوٹی میت	۱۴/
میت کے لئے پانی گرم کرنے کی لکڑی	۴/
پانی بھرنے اور گرم کرنے کی مزدوری	۲/
بڑی میت کے برگے، فی برگہ	۲½/
چھوٹی میت کے برگے، فی برگہ	۱¾/

(نوٹ: برگہ لکڑی کے اس تختے کو کہتے ہیں جو قبر کے گڑھے میں میت کے اوپر رکھے جاتے ہیں تاکہ مٹی نیچے نہ دب جائے)

کسی اچھے سیلون میں جائیے تو وہاں بھی گاہکوں کی سہولت کے لئے اس قسم کے بورڈ پر آپ کو مختلف چیزوں کے نرخ نظر آئیں گے۔

مردوں کی بال کٹوائی	۱۲/

بچوں کی ۳/

عورتوں کی ایک روپیہ

بچیوں کی ۸/

ڈاڑھی منڈائی ۲/

بال کٹوائی اور ڈاڑھی منڈائی ۹/

شامپو ۴/

بال کٹوائی، داڑھی منڈائی، اور شامپو ۱۰/

اگر بال کٹوائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈاڑھی بھی منڈائی جائے، تو ایک دو آنے کی رعایت ہو جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے آگے چل کر قبرستان والے بھی کچھ رعایت اپنے گاہکوں کو دے دیا کریں، کچھ اس قسم کا اعلان کر دیا جائے:"جو صاحب سال میں دو بڑی قبریں کھدوائیں گے ان کو ایک چھوٹی قبر مفت کھود کر دی جائے گی" "یا جو حضرت بیک وقت دو قبریں کھدوائیں گے، ان کو گلاب کی دو قلمیں مفت دی جائیں گی" "یا جو اصحاب کفن دفن کا سب سامان ہمارے ہاں سے خریدیں گے ان کو قبر کا نمبر ایک خوبصورت تختے پر تیتے سے کڑھا ہوا مفت ملے گا۔"

یہ بھی بہت ممکن ہے کہ آنے والے زمانے میں جب کہ ہمارے قبرستان اور زیادہ ترقی یافتہ ہو جائیں گے، قبروں کی ایڈوانس بکنگ ہوا کرے گی۔ یعنی ہم لوگ اپنے معمر عزیزوں کے لئے دو دو تین تین برس پہلے ہی کسی اچھے اور فیشن ایبل قبرستان میں سیٹ بک کرا لیا کریں گے تاکہ عین وقت پر تردد کا سامنا نہ کرنا پڑے

اس وقت مردوں کو کفنانے اور دفنانے کا انتظام بھی جدید طریقوں پر ہوگا، چنانچہ بہت ممکن ہے کہ گورکنوں کی طرف سے اخباروں میں اس قسم کے اشتہار چھپا کریں۔

عیسیٰ جی موسیٰ جی اینڈ سنز، کفن دفن کے ماہرین

میتوں کو جدید آلات کی مدد سے بغیر ہاتھ لگائے غسل دیا جاتا ہے،

اور بغیر ہاتھ لگائے کفن پہنایا جاتا ہے۔

قبرستانوں کی طرف سے بھی ایسے ہی اشتہار شائع ہوں تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔

شہر کا سب سے جدید قبرستان

جہاں مُردے اُسی طرح قبروں میں سوتے ہیں، جس طرح آپ اپنے

پُرتکلف بستروں میں سوتے ہیں۔

بمبئی شہر میں اس وقت ایسی کئی انجمنیں موجود ہیں جو میتوں کے کفن دفن کا انتظام کرتی ہیں۔ آپ کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان انجمنوں میں سے کسی ایک کو اطلاع بھیج دیجئے۔ میت کو غسل دے دلا کر، کفن وغیرہ پہنا کر اس انجمن کے آدمی آپ کے گھر سے جنازے کو اٹھا کر قبرستان لے جائیں گے۔ اور وہاں دفن کر دیں گے۔ کانوں کان خبر نہ ہوگی، جب سارا کام آپ کے اطمینان کے مطابق ہو جائے گا تو یہ انجمن آپ کو اپنا بل پیش کر دے گی۔

آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ اتفاق سے آپ کے نوکر کو موت آ دبوچتی ہے۔ آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہے مگر آپ کو ساحل سمندر پر اپنے چند ایسے دوستوں کے ہمراہ پکنک پر جانا ہے، جن سے آپ کے کاروباری مراسم ہیں۔ اس لئے آپ خود اگر کسی انجمن کے منتظم کو ملائیں گے اور فیس وغیرہ طے کر کے اس کے

کفن دفن کا انتظام کر دیں گے۔ جنازے کے ساتھ انجمن کے پیشہ ور کندھا دینے والے ہوں گے جو آپ کے مکان سے لے کر بلند آواز میں قرآن شریف کی آیت پڑھتے جائیں گے، وہاں نماز جنازہ پڑھی جائے گی جس کی اجرت بل میں شامل ہو گی۔ اور ایک بڑی قبر میں جس کی قیمت دو روپیہ چار آنے ہوتی ہے، آپ کا وفادار نوکر دفن کر دیا جائے گا۔ ساحل سمندر پر آپ بڑے اطمینان سے اپنے دوستوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے رہیں گے اور یہاں بھی ہنستے کھیلتے آپ کے نوکر کی قبر تیار ہو جائے گی۔ اور اگر آپ نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہوگا تو اس پر انجمن کے آدمی پھولوں کی ایک چادر بھی چڑھا دیں گے۔

چند روز ہوئے مجھے پھر اسی قبرستان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نوٹس بورڈ پر ایک اعلانِ عام لکھا تھا۔

مورخہ ۱۰ جون ۱۹۴۲ء سے بوجہ گرانی قبر کی کھدائی کی مزدوری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی قبر کی کھدائی ایک روپیہ چار آنہ۔ چھوٹی قبر کی کھدائی چودہ آنے۔

جنگ نے قبریں بھی مہنگی کر دی ہیں۔

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

ماہوار رسالہ "ادب لطیف" لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان "کالی شلوار" شائع ہوا تھا جسے کچھ لوگ فحش سمجھتے ہیں۔ میں ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔

افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر میں کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں۔ میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصہ گوئی مبدأ آدم سے جاری ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی۔ لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے انسان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں ہزارہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اب چونکہ کسی الہامی کتاب یا کسی پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی، اس لئے

موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ ان اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں جنہیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔

میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہوں اور اس لئے لکھتا ہوں کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں، وہی نظر وہی زاویہ میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔ "کالی شلوار" کا پس منظر ایک ویشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بیسے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں۔ جس کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لئے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بئے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا۔ وہ بئے کی طرح رات کو جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی پیدا کرنے کے لئے بجلی موجود تھی۔ اور چونکہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لئے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے۔ اس لئے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیا ہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں۔ لیکن وہ بیا ہی نہیں تھی وہ ایک عورت تھی۔۔۔ اور جب عورت کو بجلی کے پیسے دینے پڑیں، گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے، جو خدا پر بھروسہ رکھے اور فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہوگی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں

ہا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلہ موجود ہے۔ بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں ..... ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے، جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں۔ اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں — اگر ہم افیون بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض، پیچش، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لئے دوائیں اسی لئے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لئے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں اس لئے کہ گندگی ہر روز جمع ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض پیچش اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے۔ یا اگر گندگی کے نکاس کے لئے کوئی مکانکی طریقہ ایجاد ہو جائے تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں جس غرض سے ہم جاتے ہیں ظاہر ہے، وہاں ہم اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر ہم اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے، جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی شروع کر سکتی ہے جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم کیوں بات چیت نہیں کر سکتے؟

اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیئے۔ ویشیا کو مٹایئے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں اور راہ زنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کے گھڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور ان میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد، کیمیا گری

کے متعلق جو من میں آئے کہہ سکتے ہیں ۔ ہم داڑھیوں، پائجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں ۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں ۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے ۔ اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے ۔ ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں ۔

ہم ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکے کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں ۔ ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار میں کرا سکتے ہیں ۔ ایک دلّال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں ۔ جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے ۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں ۔ دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں ۔ ان دونوں کے جنازے ایک اس محلے سے اور ایک اُس محلے سے نکلوا سکتے ہیں ۔ پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں ۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اوپر سے فرشتوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے ۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا ۔ کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی ۔

ویشیا کا وجود خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا اس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی ۔

یہ لاش بگلی سڑی سہی، بدبودار سہی، متعفن سہی، بھیانک سہی، گھناونی

سہی، لیکن ماس کا منہ دیکھنے میں کیا ہرج ہے ۔ کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی۔ کیا ہم اس کے عزیز واقارب نہیں۔ ہم کبھی کبھی کفن ہٹا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے "کالی شلوار" میں ایسی لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا۔ اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔

نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا، جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

ذہین پڑھنے والوں کے لئے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہو سکتے ہیں۔ سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لئے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر "کالی شلوار" جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی تلاش کا ایک بار میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے 'ہتک' کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں۔

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈی پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات یہیں ٹھہر جاتا، پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

"وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغے سے وصول کئے تھے، اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ اور ایسا

معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

"اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھا وارو غہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا۔

"وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پتنگ کی اُس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نُچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑہ وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔"

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ میں اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں۔

"کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شئے خالی ہے جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس

نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی۔ مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا ادھر وہ دماغ کو پُر کرتی تھی اور ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان بیسواؤں کے کوٹھے پر جائے گا۔ میری سلطانہ اور میری سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہارات ہر دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں، وہ کوئی نیا جوڑ دار آسن پیش نہیں کرتیں، وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بتائیں یہ کوئی چٹپٹے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔

میرا زیرِ بحث افسانہ "کالی شلوار" اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی۔

۱۔ سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالے میں پیشہ کراتی تھی۔ بعد میں اپنے دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔

۲۔ خدا بخش خدا پر بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔

۳۔ سلطانہ کا جب کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔

۴۔ محرم سر پر آگیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوا لئے مگر وہ نہ

بنوا سکی۔ اس لئے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

۵۔ اس موقع پر شنکر آتا ہے۔ ایک آوارہ گرد۔ ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے علاوہ اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے وہ جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ سودا قبول نہیں کرتی۔

۶۔ دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اُسے سلطانہ اُسے خود بُلاتی ہے اور اسے اپنی ٹھیرے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرم کے لئے اس کے پاس ایک کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے "محرم آ رہا ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دُکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا۔ جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لئے لے آتا ہے....

خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر اعتقاد کام نہیں آتا۔ لیکن شنکر کی ذہانت کام آتی ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے؟ — کیا اس کا پلاٹ یا اس کا انداز بیان لوگوں کو دیشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اس مقصد کے لئے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا تو یہ افسانہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں ہے، اگر یہ اخلاقیت سے گرا ہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ

اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی۔ اس لئے کہ اس میں جذبات اُبھارنے والے داو رے اور ٹھمریاں نہیں ہیں۔

"کالی شلوار" جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی۔ جس کے اشعار میں آپ کی خدمت میں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

ہانتھا پانی سے ہانپتے جانا — کھُلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا — وہ ترا جیب کا لڑا دینا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا — اور دل کھول کے چمٹ جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا — ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منہ سے کچھ کچھ پڑے بکے جانا — چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑ — نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجوڑ
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس — وہ ترا مست ہو کے کہنا بس
بات باقی نہیں رہی اب تو — رات باقی نہیں رہی اب تو
کہیں تیری یہ بات نبڑے گی — یا یونہی ساری رات نبڑے گی
نہ بن باتی کچھ اب تو بات نہیں — صبح بھی ہو چکی ہے رات نہیں
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی — یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو ریخ نکلے گی — منہ سے کیوں کر نہ چیخ نکلے گی

کبھو پھر بھی تو کام ہووے گا — دیکھیو کون ساتھ سووے گا

(اقتباسات از مثنوی میر درد مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

شک ہے کہ میں نے اپنی پیاس اور بھوک کی خواہشات نفسانی کو پرچانے کے لئے ایسے اشعار نہیں لکھے۔

لب سے لب مرے ملائے رکھنا — بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے منانا — مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے — ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ — جی جانا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار — وا کرنے نہ دینا بندِ شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا — وہ تکئے پہ سر کو دے ٹپکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں — حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکلے جانا
وہ چیں بجبیں ہو کے کہنا — کن بے کسوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس — کرنا ہی نہیں ہے تو کبھی بس

(کلیاتِ مومن — مثنوی دوم — مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب سمجھوں گا۔ اس لئے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے تنہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض سے بیٹھتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں لیکن وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں ان کی حیوانیت کو شاعری کے

پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے، جو یقیناً قابلِ گرفت ہے

اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کا فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں۔ وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔

ایسی شاعری "دماغی جلق" ہے۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے لئے میں اسے معیوب سمجھتا ہوں۔ میرے افسانے کالی شلوار میں ایسا کوئی عیب نہیں۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔ میری سلطانہ سے جو اپنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی اور ان کو اُلّو کے پٹھے سمجھتی تھی کس قسم کی لذت یا کس قسم کے حظ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک دکاندار تھی۔ ٹھیٹ قسم کی دکاندار۔ اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہو گا۔ یا اس کو حافظ کا سارا دیوان ازبر یاد ہو گا۔ شراب کے ٹھیکے دار شربت بیچتے ہیں، عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ عورت بعد میں ہے، دلیشیا سب سے پہلے ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ شنکر اس سے پوچھتا ہے۔ "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟"

سلطانہ جواب دیتی ہے "جھک مارتی ہوں"۔۔۔۔۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں ہاں سے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا۔ "ٹائپ کرتا ہوں"۔ میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

فراق گورکھپوری کی اہم تصنیف

من آنم

مدیر نقوش محمد طفیل کے نام علمی خطوط جن میں حیات و کائنات، مذہب، روحانیت، اخلاق، حسن و عشق، جنسیات، ادب عالیہ، ہندوستانی ثقافت اور تہذیب جیسے موضوعات پر فراق نے کھل کر لکھا ہے اور اپنی سماجی بصیرت، سیاسی شعور، اور نکتہ رسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

یہ فراق کی شاعری نہیں دانشوری ہے

اردو کی عشقیہ شاعری، ہندوستان کی عظیم تہذیب اور قومی زندگی کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیمت : ایک سو روپے

ساقی بک ڈپو 4157A۔ اردو بازار، دہلی۔ 110006

منٹو

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔
اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری
کے سارے اسرار و رموز دفن
ہیں ۔۔۔ وہ اب بھی منوں مٹی
کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ
نگار ہے یا خدا

سعادت حسن منٹو

۱۸ اگست ۱۹۵۴ء